مقالات

تجدید و احیاء دین

مجددین امت کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر

[یہ مقالہ جریدہ "الفرقان" بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے لکھا گیا تھا اور وہیں سے شکریہ کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ اسکو ملاحظہ کرتے وقت ناظرین کرام یہ بات ملحوظ رکھیں کہ اس مضمون میں تمام مجددین کے کارناموں کا احاطہ مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف اُن بڑے بڑے مجددین کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلام کی تاریخ پر اپنا ایک مستقل نشان چھوڑ گئے ہیں۔ نیز اس امر کا بھی خیال رکھا جائے کہ تجدید کا کام بہت لوگوں نے کیا اور ہر زمانے میں بہت لوگ کرتے ہیں، مگر "مجدد" کا لقب پانے کے مستحق کم ہی ہوتے ہیں]

اسلام کی اصطلاحی زبان کے جو الفاظ کثرت سے زبانوں پر آتے ہیں اُن میں سے ایک لفظ "مجدد" بھی ہے۔ اس لفظ کا ایک مجمل مفہوم تو قریب قریب ہر شخص سمجھتا ہے، یعنی یہ کہ جو شخص دین کو از سر نو زندہ اور تازہ کرے وہ مجدد ہے، لیکن اسکے تفصیلی مفہوم کی طرف بہت کم ذہن منتقل ہوتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ تجدید (Revival) کی حقیقت کیا ہے، کس نوعیت کے کام کو "تجدید" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کام کے کتنے شعبے ہیں، مکمل تجدید کا اطلاق کس کارنامے پر ہو سکتا ہے اور جزوی تجدید کیا ہوتی ہے۔ اسی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ لوگ اُن مختلف بزرگوں کے کارناموں کی بھی پوری طرح تشخیص نہیں کر سکتے جن کو تاریخ اسلام میں مجدد قرار دیا گیا ہے۔ وہ بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ عمر ابن عبدالعزیز بھی مجدد، امام غزالی بھی

مجدّد، ابنِ تیمیہ بھی مجدّد، شیخ احمد سرہندی بھی مجدّد اور شاہ ولی اللہ بھی مجدّد۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ کون کس حیثیت سے مجدّد ہے اور اس کا تجدیدی کارنامہ کس نوعیت اور کس مرتبہ کا ہے۔ اس ذہول و غفلت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جن ناموں کے ساتھ "حضرت"، "امام"، "حجۃ الاسلام"، "قطب العارفین"، "زبدۃ السالکین"، اور اسی قسم کے الفاظ لگ جاتے ہیں انکی عقیدت مندی کا اتنا بوجھ دماغوں پر پڑ جاتا ہے کہ پھر کسی میں یہ طاقت نہیں رہتی کہ آزادی کے ساتھ ان کے کاموں کا جائزہ لیکر ٹھیک ٹھیک مشخص کر سکے کہ کس نے اس تحریک کے لیے کتنا اور کیسا کام کیا ہے، اور اس خدمت میں اُس کا حصہ کس قدر ہے۔ عموماً تحقیق کی نپی تُلی زبان کے بجائے اِن بزرگوں کے کارنامے عقیدت کی شاعرانہ زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والے پر یہ اثر پڑتا ہے، اور شائد لکھنے والے کے ذہن میں بھی یہی ہوتا ہے، کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ مردِ کامل تھا اور اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ہر حیثیت سے کمال کے آخری درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ حالانکہ اگر اب ہم کو تحریک اسلامی کی تجدید و احیاء کے لیے کوشش کرنی ہے تو اس قسم کی عقیدت مندی اور اس ابہام و اجمال سے کچھ کام نہ چلے گا۔ ہم کو پوری طرح اس تجدید کے کام کو سمجھنا پڑیگا اور اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہو گا کہ ان بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے کتنا کتنا کام کس کس طرح کیا ہے، اُن کے کارناموں سے ہم کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور ان سے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے جس کی تلافی پر اب ہمیں متوجہ ہونا چاہیے۔

یہ مضمون ایک مستقل کتاب چاہتا ہے۔ مگر کتاب لکھنے کی فرصت کہاں۔ یہی غنیمت ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ذکر خیر چھڑ گیا جسکی وجہ سے اس مضمون کی طرف چند اشارے کرنے کا موقع نکل آیا۔ شائد کہ انہی اشاروں سے کسی اللہ کے بندے کو تاریخ تجدید و احیاء دین کی تدوین کا راستہ مل جائے۔

اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش

تجدید کی حقیقت و نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسلام اور جاہلیت کی اصولی اور

تاریخی کشمکش کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، کیونکہ تجدید دراصل نام ہے جاہلیت کے ہجوم سے اسلام کو نکال کر از سرِ نو چمکا دینے کا۔ پس آدمی نہ تو تجدید کو جان سکتا ہے نہ کسی مجدد کے کام کو پرکھ سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں متصادم قوتوں کو اور انکی کشمکش کو واضح طور پر نہ سمجھ لے۔

دنیا میں انسان کی زندگی کے لیے جو نظام نامہ بھی بنایا جائیگا اسکی ابتدا لامحالہ مابعد الطبیعی یا الہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق، جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیے اور کس طرح اُسے اس دنیا میں کام کرنا چاہیے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اسکی حیثیت کیا ہے، اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائیگا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، پھر اُسی نظریۂ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی، پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورتیں اختیار کرینگے، اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لیے جتنے مذہب و مسلک بھی بنے ہیں ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے اور اصول سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطۂ نظر ہے، کیونکہ ہر دستورِ زندگی کا مزاج اسی چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے اور یہ اس کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

جزئیات و فروع سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیعی نظریے قائم ہو سکتے ہیں، اور دنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں انہوں نے انہی چار میں سے

کسی ایک کو اختیار کیا ہے :

جاہلیت خالصہ | ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جسکے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت، اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائیگا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے، اور اگر ہے تو اسکے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح شائد اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اسکو کس نے پیدا کیا اور کس لیے پیدا کیا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اسکی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اور اپنے گرد و پیش زمین کے دامن پر بہت سا سامان پھیلا ہوا دیکھتا ہے جن پر وہ اپنے ان قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا اسکی زندگی کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبع حیوانی کے مطالبات پورے کرے، اور اسکی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔ انسان سے مافوق کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اسکو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو، لہذا اس کو اپنے گرد و پیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہیے۔ بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جسکے سامنے انسان جوابدہ ہو، اسلیے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے، اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے ہی سامنے ہے، یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں۔ اسکے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابل اخذ اور قابل ترک ہونے کا فیصلہ صرف انہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائیگا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان جب جاہلیت محضہ کی حالت میں ہوتا ہے، یعنی جب اپنے محسوسات سے ماوراء کسی

حقیقت تک وہ نہیں پہنچتا یا بندگی نفس کی وجہ سے نہیں پہنچنا چاہتا، تو اسکے ذہن پر یہی نظریہ حاوی ہوتا ہے۔ دنیا پرستوں نے ہر زمانے میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور اربابِ حکومت نے، خوشحال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے، اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں، بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے۔ موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے۔ اگرچہ اہلِ مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں، نہ علمی حیثیت سے سب مادّہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں، لیکن جو روح انکے پورے نظام تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اسی انکار خدا و آخرت اور اسی مادّہ پرستانہ اخلاق ہی کی روح ہے، اور وہ کچھ اس طرح انکی زندگی میں پیوست ہو گئی ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے خدا اور آخرت کے قائل ہیں اور اخلاق میں ایک غیر مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، وہ بھی غیر شعوری طور پر اپنی واقعی زندگی میں دہریہ اور مادّہ پرست ہی ہیں، کیونکہ انکے علمی نظریہ کا انکی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان سے پہلے کے مترفین اور خدا فراموش لوگوں کی بھی تھی۔ بغداد، دمشق، دہلی اور غرناطہ کے مترفین مسلمان ہونے کی وجہ سے خدا اور آخرت کے منکر نہ تھے، مگر انکی زندگی کا سارا پروگرام اس طرح بنتا تھا کہ گویا نہ خدا ہے، نہ آخرت ہے، نہ کسی کو جواب دینا ہے، نہ کہیں سے ہدایت لینی ہے، جو کچھ ہیں ہماری خواہشات ہیں، ان خواہشات کی تکمیل میں ہر قسم کے ذرائع اور ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے کے لیے ہم آزاد ہیں اور دنیا میں جینے کی جتنی مہلت ملتی ہے اسکا بہترین مصرف بس یہ ہے کہ:

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جیسا کہ اوپر میں نے اشارہ کیا، اس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اسکی بنیاد پر ایک خالص مادّہ پرستانہ نظامِ اخلاق بنتا ہے، خواہ وہ کتابوں میں مدوّن ہو یا صرف ذہنیتوں ہی میں مرتب ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پورے نظامِ تعلیم و تربیت میں الحاد و مادّیت کی روح سرایت کر جاتی ہے۔ پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں، انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ

پر مبنی ہیں، اور قوانین کا نشوونما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے۔ پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر وہ لوگ ابھر کر آتے ہیں جو سب سے زیادہ مکار، بددیانت، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں۔ تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مملکت کی زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ شتر بے مہار کی طرح ہر حساب سے بے خوف اور ہر مواخذہ سے بے پروا ہو کر خلق خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میکیاویلی (Machiavelli) کے اصول سیاست پر انکی ساری حکمت عملی مبنی ہوتی ہے۔ انکی کتاب آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم مملکت کے دائرے میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں۔ اور مملکت کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

جاہلیت مشرکانہ

دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے مگر اس کا ایک خداوند (Master) نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت (Scientific proof) پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیال آرائی پر اسکی بنا ہے، اسلیے موہوم، محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الٰہیت کو منسوب کرنے میں مشرکین کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے، نہ کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنالی گئی اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، سیارے، زندہ اور مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، اور معانی مجردہ (Abstract Ideas) مثلاً محبت، حسن، شہوت، قوتِ تخلیق، بیماری، جنگ، لچھمی، تشنگی وغیرہ، اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان، ماہی انسان، پرند انسان، چہار سرا، ہزار دستہ، خرطوم بینی وغیرہ مشرکین کے معبودوں میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر اس دیومالا کے گرد اوہام و خرافات (Mythology) کا ایک عجیب طلسم ہوش ربا تیار ہوا ہے جس میں ہر جاہل قوم کی قوت واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری کے وہ وہ دلچسپ نمونے فراہم کیے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خداوند اعلیٰ یعنی اللہ کا تصور

نمایاں پایا گیا ہے، وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اسکے وزیر، درباری، مصاحب، عہدہ دار اور اہلکار ہیں، مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا اسلیے اسکے سارے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوند اعلیٰ کا تصور بہت دھندلا یا تقریباً مفقود ہے، وہاں ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

جاہلیت خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ گھٹیا درجہ کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے، وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئیں، مگر انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل اللّٰہوں کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی ہی رہی۔ جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جنکی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے، اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی ثبوتِ علمی کے ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انکے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہو گئی جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف توسل اور استمداد روحانی اور اکتسابِ فیض وغیرہ ناموں کے خوشنما پردوں میں وہ سب معاملات جو اللہ اور بندے کے درمیان ہوتے ہیں، اِن بزرگوں سے متعلق ہو گئے اور عملاً وہی حالت قائم ہو گئی جو اللہ کو ماننے والے اُن مشرکین کے ہاں ہے جنکے نزدیک پادشاہِ عالم انسان کی رسائی سے بہت دور ہے اور انسان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام امور نیچے کے اہلِ کاروں ہی سے وابستہ ہیں۔

فرق صرف یہ ہے کہ اُنکے ہاں یہ اہلکار علانیہ الٰہ، دیوتا، اوتار یا ابن اللہ کہلاتے ہیں، اور یہ انہیں غوث، قطب، اولیاء اور اہل اللہ وغیرہ الفاظ کے پردوں میں چھپاتے ہیں۔

یہ دوسری قسم کی جاہلیت تاریخ کے دوران میں عموماً پہلی قسم کی جاہلیت، یعنی جاہلیت خالصہ کے ساتھ تعاون کرتی رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، روم وغیرہ ممالک کے تمدن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں اور موجودہ زمانہ میں جاپان کے تمدن کا بھی یہی حال ہے۔ اس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف میں اشارہ کرونگا۔

اولاً مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا کوئی تعلق اپنے معبودوں کے ساتھ اِسکے سوا نہیں ہوتا کہ یہ اپنے خیال میں انکو صاحب اختیار اور نافع و ضار سمجھ لیتا ہے اور مختلف مراسم عبودیت کے ذریعہ سے اپنے دنیوی مقاصد میں اُنکی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ وہاں اِسکو کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا قانون و ضابطہ ملے، تو اسکا کوئی امکان ہی نہیں، کیونکہ وہاں کوئی واقع میں خدا ہو تو ہدایت اور قانون بھیجے۔ پس جب ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مشرک انسان لامحالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اس طرح وہی جاہلیت محضہ بر سر کار آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص جاہلیت کے تمدن اور مشرکانہ تمدن میں اِسکے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ مندروں، پجاریوں اور عبادات کا سلسلہ ہوتا ہے، اور دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اخلاق و اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں، ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ یونان قدیم اور بت پرست روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

ثانیاً علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے لیے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اس باب میں بھی مشرک انسان جاہلیت محضہ ہی کا رخ اختیار کرتا ہے اور مشرک سوسائٹی کا سارا دماغی نشو و نما اُسی ڈھنگ پر ہوتا ہے جس پر خالص جاہلی سوسائٹی میں ہوا کرتا ہے۔ فرق

Speculation
صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوت واہمہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اسلیے انکے افکار میں خیال آرائی کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ملاحدہ ذرا عملی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اسلیے نرے خیالی فلسفوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، البتہ جب وہ خدا کے بغیر کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انکی استدلالی کھینچ تان بھی اُتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی میتھالوجی۔ بہرحال علمی حیثیت سے شرک اور جاہلیت خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا، اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ موجودہ یورپ اپنے نظریات میں قدیم یونان و روم سے اِس طرح سلسلہ جوڑتا ہے کہ گویا یہ بیٹا ہے اور وہ باپ۔

ثالثاً مشرک سوسائٹی اُن تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہوتی ہے جنکو خالص جاہلی سوسائٹی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور جاہلیت خالصہ کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، شاہی خاندان اور مذہبی طبقے مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں، خاندانوں پر خاندانوں کے اور نسلوں پر نسلوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے، اور اس طرح جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اسکے خالص جاہلی سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی، قوم پرستی، قومی امپیریلزم، ڈکٹیٹر شپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے، انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے، اور انسانیت کو تقسیم کر کے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لیے صیاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

جاہلیت راہبانہ

تیسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دار العذاب ہے، انسان کی روح اس قفس عنصری میں دراصل ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اصل میں اس قیدخانہ کے طوق و سلاسل

ہیں۔ انسان اس دنیا اور اسکی چیزوں سے جتنا تعلق رکھے گا اُتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اُسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائیگا۔ نجات کی صورت اسکے سوا کوئی نہیں ہے کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے خواہشات کو مٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے اُن تمام محبتوں کو جو دنیوی اشیاء اور گوشت و خون کی رشتہ داریوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں، دل سے نکال دیا جائے، اور اپنے اس دشمن، یعنی نفس و جسم کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اسکا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائیگی اور نجات کے بلند مقامات پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرے گی۔

یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی (Anti-social) نظریہ ہے، مگر تمدن پر یہ متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اسکی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جسکی مختلف شکلیں ویدانتزم، اشراقیت (Neo-Platonism) یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت، اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل جل کر لٹریچر، اعتقادات، اخلاقیات اور عملی زندگی میں نفوذ کرتی ہیں اور جہاں جہاں انکے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

پہلی دونوں قسم کی جاہلیتوں کے ساتھ اس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے:

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لیے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولی بن کر آزادی کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں، اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیے چلے جاتے ہیں۔

(۲) اس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں وہ انکے اندر غلط قسم کا صبر و تحمل، اور

مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کر کے انہیں ظالموں کے لیے نرم نوالہ بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ، امراء، اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں، اور یہ خوب آرام سے ان کی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری اور روحانی ریاست سے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔

(۳) جب یہ رہبانی فلسفہ و اخلاق، انسانی فطرت سے شکست کھاتا ہے تو کتاب الحیل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ دل کھول کر گناہ کیا جا سکے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کہیں ہوس رانی کے لیے عشق مجازی کا حیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی بجھا بھی لی جائے اور تقدس بھی جوں کا توں قائم رہے۔ اور کہیں ترک دنیا کے پردے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے سانٹھ گانٹھ کی جاتی ہے اور روحانی امارت کا وہ جال پھیلایا جاتا ہے جسکی بدترین مثالیں روم کے پاپاؤں، اور مشرقی دنیا کے گدی نشینوں نے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں جب یہ گھس آتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اسکی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ یہ دنیا کو دار العمل، دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دار العذاب اور "مایا کے جال" کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس بنیادی تغیر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دنیا کے معاملات کو چلانے نہیں آیا ہوں بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دور بھاگنا چاہیے۔ میرے لیے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں یہاں نان کو آپریٹر کی طرح رہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے اُن سے کنارہ کروں۔ اس تصور کے ساتھ آدمی دنیا اور اسکے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے اور بارِ خلافت سنبھالنا تو درکنار، بارِ تمدن کو بھی اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اسکے یہ پوٹا

نظام شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور اوامر و نواہی کا یہ مفہوم بالکلیہ ساقط ہو جاتا ہے کہ یہ حیات دنیا کی اصلاح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اسکے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ زندگی کا کفارہ ہیں۔ بس انہی کو پورے انہماک سے ٹھیک ناپ تول کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیے تاکہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اس ذہنیت نے انبیاء کی امتوں میں سے ایک گروہ کو مراقبہ و مکاشفہ، چلہ کشی و ریاضت، اور اوراد وظائف، احزاب و اعمال، سیر مقامات اور حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں کے چکر میں ڈال کر مستحبات و نوافل کے التزام میں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے خلافت الٰہیہ کے اُس کام سے غافل کر دیا جسکو جاری کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام آئے تھے۔ اور دوسرے گروہ میں تقشف، تعمق فی الدین، غلو، موشگافی، چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ناپ تول اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی، حتیٰ کہ ان کے لیے خدا کا دین ایک ایسا نازک آبگینہ بن گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیچاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کی نذر ہونے لگا کہ کہیں کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جائے۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے کہ جمود، تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں یہ قابلیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہ جہاں بیں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں، دین کے عالمگیر اصول و کلیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دنیا کی امامت و رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

اسلام

چوتھا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جسکا ایک جز ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے۔ اسی نے اسکو بنایا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا واحد حاکم ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ سب کے سب تابع امر ہیں اور اختیارات بالکلیہ اسی ایک مالک و فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے، یعنی رعیت ہونا

یا نہ ہونا اسکی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔ اس نظامِ حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔ پیدائشی رعیت اور ایک جزوِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اسکے لیے کوئی راستہ اسکے سوا نہیں ہے کہ جس طرح مملکت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لیے طریقِ زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اسکی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لیے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیرِ امر کرتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اس طرح چل رہی ہے کہ نہ اسکا حاکم نظر آتا ہے نہ کار پرداز ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہوا دیکھتا ہے، اس کے درمیان اپنے آپ کو موجود پاتا ہے، اور ظاہر حواس سے کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے حساب دینا ہے۔ اعیان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت و مسئولیت (Responsibility) کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر عیاناً وحی اترتی دکھائی دے، یا کوئی ایسی صریح علامت ان کے ساتھ اترے جس کو دیکھ کر انکی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اسکی قدرت دیدی جاتی ہے، ذرائع بہم پہنچا دیے جاتے ہیں، اور بڑی لمبی ڈھیل دی جاتی ہے، حتیٰ کہ شرارت و عصیان کی آخری حدود کو پہنچنے تک کوئی رکاوٹ اسے پیش نہیں آتی۔ مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا، پوری آزادی دی جاتی ہے کہ جس جس کی بندگی

عبادت، اطاعت کرنا چاہے کرے۔ دونوں صورتوں (یعنی بغاوت اور بندگیٔ غیر کی صورتوں) میں رزق برابر ملتا ہے، سامانِ زندگی، وسائلِ کار، اسبابِ عیش حسبِ حیثیت خوب دیے جاتے ہیں، اور مرتے دم تک دیے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باغی یا کسی بندۂ غیر سے محض اس جرم کی پاداش میں اسبابِ دنیا روک لیے جائیں۔ یہ سارا طرزِ کارروائی صرف اسلیے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تمیز، استدلال، ارادہ اور اختیار کی جو قوتیں دی ہیں، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اسکو ایک طرح کے حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ اسکی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لیے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اسکی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کرکے اس سے منہ موڑتا ہے۔ اسبابِ زندگی کا سرمایہ اور وسائلِ کار دیے گئے ہیں اور عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے کیونکہ جب تک کسی کارکن کو سرمایہ، وسائل، اور کام کا موقع نہ دیا جائے اسکی لیاقت وعدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔

یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اسلیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں ہے بلکہ امتحان کا سامان ہے۔ اور جو تکالیف، مصائب، شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عملِ بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اُس قانونِ طبیعی کے تحت، جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصلی حساب، جانچ پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور اُسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، اور قابلِ اخذ یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا برا ہوگا، صرف اُس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر کرکے

بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے ، یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اسکی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں ۔ ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ (آزادی انتخاب رکھنے کے باجود) اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اسکے امر شرعی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں ۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتدا سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں ۔ اس نظریہ کی بنیاد پر تمام واقعاتِ عالم کی مکمل توجیہ (explanation) ہوتی ہے ، کائنات کے تمام آثار (Phenomena) کی پوری تعبیر ملتی ہے اور کسی مشاہدہ یا کسی تجربہ سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں ۔ یہ ایک مستقل نظام فلسفہ پیدا کرتا ہے جو جاہلیت کے فلسفوں سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے ۔ کائنات اور خود وجود انسانی کے متعلق معلومات کے پورے ذخیرہ کو ایک دوسرے ڈھنگ پر مرتب کرتا ہے جو جاہلی علوم کی ترتیب سے سراسر متبائن ہے ۔ ادب اور ہنر (Art & literature) کے نشو و نما کا ایک الگ راستہ بناتا ہے جو جاہلی ادب و ہنر کے تمام راستوں سے متغائر ہے ۔ زندگی کے جملہ معاملات میں ایک خاص زاویۂ نظر اور ایک خاص مقصد پیدا کرتا ہے جو جاہلی مقاصد و نقطہائے نظر سے اپنی روح اور اپنے جوہر میں کسی طرح میل نہیں کھاتا ۔ اخلاق کا ایک علحدہ نظام بناتا ہے جسکو جاہلی اخلاقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ۔ پھر ان علمی و اخلاقی بنیادوں پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے اسکی نوعیت تمام جاہلی تہذیبوں کی نوعیت سے قطعی مختلف ہوتی ہے اور اُسکو سنبھالنے کے لیے ایک اور ہی طرز کے نظام تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جسکے اصول جاہلیت کے ہر نظام تعلیم و تربیت سے کامل تضاد کی نسبت رکھتے ہیں ۔ فی الجملہ اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد قہار کی حاکمیت ، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے ، بخلاف اسکے ہر جاہلی تہذیب کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری ، بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے ۔ اسی لیے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اسکے خط و خال اور رنگ

و روغن جاہلی تہذیب کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں۔

اسکے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر بنتی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، لباس، خوراک، طرز زندگی، آداب اطوار، شخصی کردار، کسب معاش، صرف دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات، انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں، لین دین کے معاملات، دولت کی تقسیم، مملکت کا انتظام، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، سول سروس کی تنظیم، قانون کے اصول، تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط، عدالت، پولیس، احتساب، مالگذاری، فینانس، امور نافعہ (Public works)، صنعت و تجارت، خبر رسانی، تعلیمات اور دوسرے تمام محکموں کی پالیسی، فوج کی تربیت و تنظیم، جنگ و صلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور خارجی سیاست، غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر جز میں ایک واضح خط امتیاز اسکو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔ اسکی ہر چیز میں اول سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مقصد اور ایک خاص اخلاقی رویہ کار فرما ہوتا ہے جسکا براہ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیت مطلقہ، اور انسان کی محکومیت و مسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔

نبی کے کام کی نوعیت

اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام پے در پے بھیجے گئے تھے۔

رہبانی تہذیب کو مستثنیٰ کر کے ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبار دنیا کو چلانے کے لیے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو، قطع نظر اسکے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، طبعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے، زمام کار اپنے ہاتھ میں لے اور زندگی کا نقشہ اپنے طرز پر بنائے۔ حکومت کے بغیر کسی نظریہ و ضابطہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا محض بے معنی ہے۔ راہب تو دنیا کے معاملات

کو چلانا ہی نہیں چاہتا بلکہ ایک خاص قسم کے "سلوک" سے اپنی خیالی نجات کی منزل تک باہر ہی باہر پہنچ جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اسلیے نہ اسکو حکومت کی حاجت نہ طلب۔ مگر جو دنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ایک خاص ڈھنگ لیکر اٹھے اور اسی ڈھنگ میں انسان کی فلاح و سعادت کا معتقد ہو، اُسکے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کی کنجیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اپنے نقشہ پر عملدرآمد کرنیکی طاقت جب تک وہ حاصل نہ کرے، اس کا نقشہ واقعات کی دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کاغذ پر اور ذہنوں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ جس تہذیب کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے، دنیا کا سارا کاروبار اسی کے نقشہ پر چلتا ہے، وہی علوم و افکار اور فنون و آداب کی رہنمائی کرتی ہے، وہی اخلاق کے سانچے بناتی ہے، وہی تعلیم و تربیت عامہ کا انتظام کرتی ہے، اسی کے قوانین پر سارا انتظام تمدن مبنی ہوتا ہے، اور اسی کی پالیسی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی میں کہیں بھی اُس تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ جب ایک طویل مدت تک حکمراں تہذیب کا دور دورہ رہتا ہے تو غیر حکمران تہذیب عمل کی دنیا میں خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اسکی طرف ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ دنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔ اسکے نام نہاد علمبردار اور اسکی لیڈرشپ کے بزعم خود وارثین تک تہذیب مخالف سے مدارات (Compromise) اور آدھے پونے کا مشترک معاملہ کرنے پر اتر آتے ہیں حالانکہ حکمرانی میں دو بالکل مختلف الاصول تہذیبوں کے درمیان مقاسمت و مصالحت قطعی غیر ممکن العمل چیز ہے اور انسانی تمدن اس شرک کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بٹائی کو ممکن العمل خیال کرنا عقل کی کمی پر دلالت کرتا ہے اور اسکے لیے راضی ہونا ایمان اور ہمت کی کمی پر۔

پس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا کہ حکومتِ الٰہیہ قائم کرکے اُس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہل جاہلیت کو یہ حق دینے کے لیے تیار تھے کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد تک اُنکے عمل کا اثر انہی کی ذات تک محدود رہتا ہے اُس میں اپنے جاہلی

طریقوں پر بھی چلتے رہیں - مگر وہ انہیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے کہ اقتدار کی کنجیاں اُنکے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو جاہلیت کے قوانین پر چلائیں - اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی - بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں، جیسے حضرت ابراہیمؑ - بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی اُن کا کام ختم ہو گیا، جیسے حضرت مسیحؑ - اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت موسیٰ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین - فی الجملہ تمام انبیاء کرام کے کام پر مجموعی حیثیت سے جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کام کی نوعیت یہ پائی جاتی ہے:

(۱) عام انسانوں کے اندر فکری و ذہنی انقلاب برپا کرنا - خالص اسلامی نقطۂ نظر و طرزِ فکر اور رویۂ اخلاقی کو انکے اندر اس حد تک پیوست کر دینا کہ انکے سوچنے کا طریقہ، زندگی کا مقصد، اقدار و قیمت کا معیار اور عمل کا ڈھنگ بالکل اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے -

(۲) جو لوگ اس تعلیم و تربیت کا اثر قبول کر لیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بنا کر جاہلیت کے ہاتھوں سے اقتدار چھیننے کی جدوجہد کرنا اور اس جدوجہد میں تمام ان اسباب سے کام لینا جو وقت کے تمدن میں موجود ہوں

(۳) اسلامی نظام حکومت قائم کر کے تمدن کے تمام شعبوں کو خالص اسلام کی اساس پر مرتب کر دینا اور ایسی تدابیر اختیار کرنا کہ ایک طرف اسلامی انقلاب کا دائرہ روئے زمین پر وسیع ہوتا جائے اور دوسری طرف تبلیغ اور تناسل کے ذریعہ سے جماعت اسلامی میں جتنی نئی بھرتی ہو اسکی ذہنی و اخلاقی تربیت پورے اسلامی طرز پر ہوتی رہے -

خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں تکمیل کو پہنچا دیا - آپکے بعد ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما، دو ایسے کامل لیڈر اسلام کو میسر آئے جنہوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپکے کام کو جاری رکھا - پھر زمامِ قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداءً چند سال

تک وہ پورا نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔

جاہلیت کا حملہ مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جاتا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ، جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، اُن تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں، اسلیے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنیکا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔ ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر اُنکی جان کی قربانی بھی اس انقلابِ معکوس (counter-revolution) کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا، ملکِ عضوض (Tyrant kingdom) نے اسکی جگہ لے لی، اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

حکومت پر قبضہ کرنیکے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اُسکے ہاتھ میں تھی اور اسلام زورِ حکومت سے محروم ہونیکے بعد اُسکے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے یا مشرکین، و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اسکے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برا ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لیے آپکے ساتھ ہو جائینگے اور کوئی مسلمان علانیہ اُس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جائیے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اُسکی حمایت پر کمربستہ ہو جائینگے اور الٹا آپکو موردِ الزام بنا ڈالینگے۔ جاہلی امارت کی مسند

اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلّم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جسکے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور انکے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے:

جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جسکو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ بادشاہوں کو الٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اسلیے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانے سے وہی مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو الٰہ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اہلِ لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبیعی امر تھا کہ اسکے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہو اور علوم و فنون بھی اُسی طرز پر مرتب و مدون ہوں، کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں، اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اُس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی، اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال کا مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پرزے نکالنے لگا اور "عقائد" کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ رقص، موسیقی اور تصویر کشی جیسے خالص جاہلی آرٹ بھی از سرِ نو اُن قوموں میں بار پانے لگے جنکو اسلام نے ان فتنوں سے بچا لیا تھا۔[۱]

جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر انکو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج

[۱] مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی جیسے لوگوں نے ان بادشاہوں کے (۶۳) ان کارناموں کو اسلامی تہذیب و تمدن کی خدمات میں شمار کیا ہے!

پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لیے چلے آئے اور یہاں انکو صرف اتنی تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ بزرگان اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کریں، پرانے معبدوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں، اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے انکی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات اُنکے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام کے اندر نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں۔ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے آیات اور احادیث کو توڑ مروڑ کر اسلام میں اولیاء پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکالی، مشرکانہ اعمال کے لیے اسلام کی اصطلاحی زبان میں سے الفاظ بہم پہنچائے اور اس نئی شریعت کے لیے رسموں کی ایسی صورتیں تجویز کیں کہ شرکِ جلی کی تعریف میں نہ آسکیں۔ اِس فنی امداد کے بغیر اسلام کے دائرے میں شرک بے چارہ کہاں بار پا سکتا تھا؟

جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشائخ، زھاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کیں جنکی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائیٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا، بلکہ فی الواقع سوسائیٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا، پادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔

انہی تینوں قسم کی جاہلیتوں کے ہجوم سے اسلام کو نکالنا اور پھر سے چمکا دینا وہ کام تھا جس کے لیے دین کو مجددین کی ضرورت پیش آئی۔ اگرچہ یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ اس طغیانِ جاہلیت میں اسلام بالکل ختم ہو گیا تھا اور جاہلیت کلیتہً غالب آگئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جو قومیں اسلام سے متاثر ہو چکی تھیں یا بعد میں متاثر ہوئیں انکی زندگیوں میں اسلام کا اصلاحی اثر تھوڑا یا بہت ضرور موجود رہا۔ جبار اور غیر ذمہ دار بادشاہوں تک میں اسلام کے اثر سے کہیں نہ کہیں خوفِ خدا کی جھلک نظر آہی جاتی تھی۔ جن شاہی خاندانوں میں خدائی کا رنگ جما

ہوا تھا انکی آغوش میں دیندار، عادل اور متقی انسان بھی پیدا ہوجاتے تھے اور وہ شاہی اختیارات رکھنے کے باوجود حتی الامکان ذمہ دارانہ حکومت کرتے تھے۔ اسی طرح امارت و ریاست کے ایوانوں میں، فلسفہ و حکمت کے مدرسوں میں، تجارت و صنعت کی کارگاہوں میں، ترک و تجرید کی خانقاہوں میں، اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام اپنے بالواسطہ اثرات کم و بیش برابر پہنچاتا رہا، اور عوام کے اندر بھی مشرکانہ جاہلیت کی دراندازی کے باوجود اس نے اعتقاد، اخلاق اور معاشرت میں اصلاحی اور انسدادی دونوں حیثیتوں سے اپنا نفوذ جاری رکھا جسکی وجہ سے مسلمان قوموں کا معیار اخلاق بہرحال غیر مسلم قوموں سے ہمیشہ بلند تر رہا۔ علاوہ بریں ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی برابر موجود رہے جو اسلام کی پیروی پر ثابت قدم تھے اور اسلامی علم و عمل کو اپنی زندگی میں اور اپنے محدود حلقۂ اثر میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جو مقصدِ اصلی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا تھا اسکے لیے یہ دونوں چیزیں ناکافی تھیں۔ نہ یہ بات کافی تھی کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام محض ایک ثانوی قوت کی حیثیت سے کام کرے، اور نہ یہ بات کافی تھی کہ چند افراد یا اور چند دہا محدود انفرادی زندگیوں میں اسلام کے حامل بنے رہیں اور وسیع تر اجتماعی زندگی میں اسلام و جاہلیت کے مختلف النوع مرکبات پھیلے رہیں۔ لہٰذا دین کو ہر دور میں ایسی طاقتور شخصیتوں کی ضرورت تھی اور ہے جو زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدل کر پھر اسلام کی طرف پھیر دیں، خواہ کلاً یا جزءً۔ انہی شخصیتوں کا نام مجدد ہے۔

کارِ تجدید کی نوعیت

اب قبل اسکے کہ ہم مجددین امت کے کارناموں کا جائزہ لیں، ہمیں خود اس کارِ تجدید کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

عموماً لوگ تجدّد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر متجدد کو مجدد کہنے لگتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیا طریقہ نکالے اور اسکو ذرا زور سے چلادے وہ مجدّد ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو برسر انحطاط دیکھ کر اسکو دنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانہ کی برسرِ عروج جاہلیت سے مصالحت کرکے اسلام و جاہلیت کا ایک نیا مخلوطہ تیار کر دیتے ہیں، یا فقط نام باقی رکھ کر اُس قوم کو پوری

جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں، اُنکو مجدّد کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ مجدّد نہیں متجدد ہوتے ہیں، اور اُنکا کام تجدید نہیں تجدّد ہوتا ہے۔ تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہے۔ جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا کام تجدید نہیں ہے، اور نہ اسلام و جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے، بلکہ دراصل تجدید کا کام یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزاء سے چھانٹ کر الگ کیا جائے، اور کسی نہ کسی حد تک اسکو اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدّد، جاہلیت کے مقابلہ میں سخت غیر مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے، اور کسی خفیف سے خفیف جزء میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا۔

مجدّد نبی نہیں ہوتا مگر اپنے مزاج میں مزاجِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ نہایت صاف دماغ، حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت، اپنے ماحول اور صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنے کی قوت، زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیرِ نو کی غیر معمولی اہلیت، اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں مکمل شرحِ صدر، نقطۂ نظر اور فہم و شعور میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان تمیز کرنا، اور مدتہائے دراز کی الجھنوں میں سے امرِ حق کو ڈھونڈ کر الگ نکال لینا، یہ وہ خصوصیات ہیں جنکے بغیر کوئی شخص مجدّد نہیں ہو سکتا، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اُس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں۔

لیکن وہ بنیادی چیز جو مجدّد کو نبی سے جدا کرتی ہے، یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امرِ تشریعی سے مامور ہوتا ہے، اسکو اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے، اسکے پاس وحی آتی ہے، وہ اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے، اسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی پڑتی ہے، اور اسکے دعوے ہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر کفر و ایمان کا مدار ہوتا ہے۔ برعکس اسکے مجدّد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اگر مامور بھی ہوتا ہے تو امرِ تکوینی سے نہ کہ امرِ تشریعی سے۔ بسا اوقات اسکو خود اپنے مجدّد ہونے کی خبر

نہیں ہوتی بلکہ اسکے مرنے کے بعد اسکی زندگی کے کارنامے سے لوگوں کو اسکے مجدد ہونے کا علم ہوتا ہے۔ اُس پر الہام ہونا ضروری نہیں اور اگر ہوتا ہو تو لازم نہیں کہ اسے الہام کا شعور رہو۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا، نہ ایسا کرنیکا حق رکھتا ہے، کیونکہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اگرچہ اسکے زمانے کے تمام اہل خیر و صلاح رفتہ رفتہ اسکے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس سے الگ رہتے ہیں جنکی طبیعت میں کوئی ٹیڑھ ہوتی ہے مگر بہرحال اسکو ماننا مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہوتا۔ ان تمام فروق کیساتھ مجدد کو فی الجملہ اُسی نوعیت کا کام کرنا ہوتا ہے جو نبی کے کام کی نوعیت ہے۔

اس کارِ تجدید کے مختلف شعبے حسب ذیل ہیں :-

(۱) اپنے ماحول کی صحیح تشخیص، یعنی حالات کا پورا جائزہ لیکر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے، کن کن راستوں سے آئی ہے، اس کی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں، اور اسلام اس وقت ٹھیک کس حالت میں ہے۔

(۲) اصلاح کی تجویز، یعنی یہ تعین کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

(۳) خود اپنے حدود کا تعین، یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستہ سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں۔

(۴) ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا، نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علوم اسلامی کا احیاء کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سر نو تازہ کر دینا۔

(۵) عملی اصلاح کی کوشش، یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباع شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا، اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں۔

(۶) اجتہاد فی الدین، یعنی دین کے اصول کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقائے تمدن

کی سمت کا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا، اور یہ تعین کرنا کہ اصولِ شرع کے تحت تمدن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح ردوبدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اسکے مقاصد پورے ہوں، اور تمدن کے صحیح ارتقار میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

(۷) دفاعی جدوجہد، یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لیے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

(۸) احیار نظام اسلامی، یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سرِ نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحبِ شریعت علیہ السلام نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش، یعنی صرف ایک ملک یا ان ممالک میں جہاں مسلمان پہلے سے موجود ہوں، اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا، بلکہ ایک ایسی طاقت ور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی و انقلابی دعوت عام انسانوں میں پھیل جائے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے، ساری دنیا کے نظام تمدن میں اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو، اور عالم انسانی کی اخلاقی، فکری اور سیاسی امامت و ریاست اسلام کے ہاتھ میں آئے۔

ان شعبوں پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین مدّات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لیے ناگزیر ہیں جو تجدید کی خدمت انجام دے، لیکن باقی ۶ مدیں ایسی ہیں جنکا جامع ہونا مجدّد ہونے کے لیے شرط نہیں ہے، بلکہ جس نے ایک، دو، تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مجدد، جزوی مجدد ہوگا، کامل مجدّد نہ ہوگا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثتِ نبوت کا حق ادا کر دے۔

مجدد کامل کا مقام | تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے اُن میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی لیڈر کا نام الامام المہدی ہے جس کے بارے میں صاف پیشنگوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں[1]

---

[1] اگرچہ یہ پیشنگوئیاں مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں، مگر یہاں اُس روایت کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو شاطبی نے موافقات میں، اور مولانا اسماعیل شہید نے منصب امامت میں نقل کی ہے:-

ان اول دینکم نبوۃ ورحمۃ وتکون فیکم ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ	تمہارے دین کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جل جلالہ اس کو اٹھا لیگا۔
ثم تکون خلافۃ علی منھاج النبوۃ ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ	پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تکون ملکا عاضا فیکون ماشاء اللہ ان یکون ثم یرفعہ اللہ جل جلالہ	پھر بد اطوار بادشاہی ہوگی اور جو کچھ اللہ چاہے گا وہ ہوگا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تکون ملکا جبریۃ فتکون ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ	پھر جبر کی فرمانروائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہیگا رہیگی۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تکون خلافۃ علی منھاج النبوۃ تعمل فی الناس بسنۃ النبی ویلقی الاسلام بجرانہ فی	پھر وہی خلافت بطریق نبوت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سنت کے مطابق عمل کریگی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائیگا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ ہو)

آج کل لوگ نادانی کی وجہ سے اس نام کو سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ کسی آنے والے مردِ کامل کے انتظار نے جاہل مسلمانوں کے قوائے عمل کو سرد کر دیا ہے، اسلیے ان کی رائے یہ ہے کہ جس حقیقت کا غلط مفہوم لیکر جاہل لوگ بے عمل ہو جائیں وہ سرے سے حقیقت ہی نہ ہونی چاہیے نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں کسی "مردے از غیب" کی آمد کا عقیدہ پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ محض ایک وہم ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح پچھلے انبیاء نے بھی اپنی قوموں کو یہ خوش خبری دی ہو کہ نوعِ انسان کی دنیوی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک دفعہ اسلام ساری دنیا کا دین ہے گا، اور انسان کے بنائے ہوئے سارے "ازموں" کی ناکامی کے بعد آخر کار تباہیوں کا مارا ہوا انسان اُس "ازم" کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو گا جسے خدا نے بنایا ہے، اور یہ نعمت انسان کو ایک ایسے عظیم الشان لیڈر کی بدولت نصیب ہو گی جو انبیاء کے طریقہ پر کام کر کے اسلام کو اسکی صحیح صورت میں پوری طرح نافذ کر دیگا،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ — الارض یرضی عنہا ساکن السماء وساکن الارض لا تدع السماء من قطرہ الا صبتہ مدرارا ولا تدع الارض من نباتہا و برکاتہا شیئاً الا اخرجتہ

اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اسناد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنیً یہ ان تمام روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اسی معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ اس میں تاریخ کے پانچ مرحلوں کی طرف صاف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے تین گذر چکے ہیں اور چوتھا اب گذر رہا ہے۔ آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشینگوئی کی گئی ہے تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اسکی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے "ازم" آزمائے جا چکے ہیں اور بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ آدمی کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔

تو آخر اس میں وہم کی کونسی بات ہے؟ بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ چیز دنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور جہالت نے اسکی روح نکال کر اوہام کے لبادے اسکے گرد لپیٹ دیے ہوں۔

مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی اُن متجددین سے جو اسکے قائل نہیں ہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہونگے، تسبیح ہاتھ میں لیے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہونگے، آتے ہی انا المہدی کا اعلان کرینگے، علماء اور مشائخ کتابیں لیے ہوئے پہنچ جائینگے اور لکھی ہوئی علامتوں سے انکے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کرینگے، پھر بیعت ہوگی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائیگا، چلے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" انکے جھنڈے تلے جمع ہونگے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیے برائے نام چلانی پڑیگی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے چلیگا، پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائینگے، جس کافر پر نظر مار دینگے تڑپ کر بے ہوش ہو جائیگا اور محض بد دعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائینگے۔ عقیدۂ ظہور مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اسکو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی، زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا، عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبّر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دیگا، اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسکی "جدتوں" کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کرینگے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اسکی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائیگا۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کریگا، بلکہ شائد اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اسکی

موت کے بعد اسکے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہو گا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جسکی آمد کا مژدہ سُنایا گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مہدی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی اِن حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اُسکے کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات، اور چلّوں اور "مجاہدوں" کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک "انقلابی لیڈر" کو دنیا میں جس طرح شدید جد و جہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گذرنا ہو گا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (School of thought) پیدا کریگا، ذہنیتوں کو بدلے گا، ایک زبردست تحریک اٹھائیگا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی، جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اسکو کچلنے کی کوشش کریگی، مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کریگا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی، اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوج کمال پر پہنچ جائیگی جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ "اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کریگا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دیگی"۔

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے ایک عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جسکی ہمہ گیر و پرزور قیادت میں یہ انقلاب رونما ہو گا۔ جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سُن کر حیرت ہوتی ہے مجھے انکی عقل پر حیرت ہوتی ہے جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمۂ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت ہی کا

ظہور کیوں مستبعد ہو؟

جزوی مجددین اور ان کا کام | تاریخی ترتیب کو چھوڑ کر مستقبل کے مجدد اعظم کا ذکر میں نے پہلے اسلیے کر دیا کہ لوگ پہلے مجدد کامل کے مرتبہ و مقام سے واقف ہو جائیں تاکہ کمال مطلوب کے مقابلہ میں انکے لیے جزوی تجدیدوں کے مرتبہ و مقام کا اندازہ کرنا آسان ہو جائے۔ اب میں ایک مختصر نقشہ اس تجدیدی کام کا پیش کرونگا جو اب تک انجام پا چکا ہے۔

عمر ابن عبد العزیز

اسلام کے سب سے پہلے مجدد عمر ابن عبد العزیزؒ[1] ہیں۔ شاہی خاندان میں آنکھ کھولی۔ ہوش سنبھالا تو اپنے باپ کو مصر جیسے عظیم الشان صوبہ کا گورنر پایا۔ بڑے ہوئے تو خود اموی سلطنت کے ماتحت گورنری پر مامور ہوئے۔ شاہان بنی امیہ نے جن جاگیروں سے اپنے خاندان کو مالا مال کیا تھا اُن میں ان کا اور اِنکے گھرانے کا بھی بہت بڑا حصہ تھا، حتیٰ کہ خاص انکی ذاتی جائداد کی آمدنی پچاس ہزار اشرفی سالانہ تک پہنچتی تھی۔ رئیسوں کی طرح پوری شان سے رہتے تھے۔ لباس، خوراک، سواری، مکان، عادات و خصائل سب وہی تھے جو شاہی حکومت میں شاہزادوں کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا ماحول اُس کام سے دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا تھا جو بعد میں انہوں نے انجام دیا۔ لیکن انکی ماں حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پچاس ہی برس ہوئے تھے جب وہ پیدا ہوئے۔ انکے زمانہ میں صحابہ اور تابعین بکثرت موجود تھے۔ ابتدا میں انہوں نے حدیث اور فقہ کی پوری تعلیم پائی تھی یہاں تک کہ محدثین کی صفِ اول میں شمار ہوتے تھے اور فقہ میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ پس علمی حیثیت سے تو اُن کے لیے یہ جاننے اور سمجھنے میں کوئی دقت نہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین مہدیین کے عہد میں تمدن کی اساس کن چیزوں پر تھی اور جب خلافت پادشاہی سے بدلی تو ان بنیادوں میں کس نوعیت کا تغیر واقع ہوا۔ البتہ جو چیز عملی حیثیت سے اُن کے راستے میں رکاوٹ ہو سکتی تھی وہ یہ تھی کہ اس جاہلی انقلاب کا بانی خود ان کا اپنا خاندان تھا، اُس کے تمام فائدے اور سب عہدے و مناصب

[1] سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

فائدے انکے بھائی بندوں اور خود اُن کی ذات اور اُنکے بال بچوں کو پہنچتے تھے، اور اُنکی خاندانی عصبیت، ذاتی طمع اور اپنی آئندہ نسل کی دنیوی خیر خواہی کا پورا تقاضا یہ تھا کہ وہ بھی تختِ شاہی پر فرعون بن کر بیٹھیں، اپنے علم اور ضمیر کو ٹھوس مادّی فائدوں کے مقابلہ میں قربان کریں اور حق، انصاف، اخلاق اور اصول کے چکر میں نہ پڑیں ۔ مگر جب ۳۷ سال کی عمر میں بالکل اتفاقی طور پر تختِ شاہی اُن کے حصہ میں آیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ کس قدر عظیم الشان ذمہ داری ان پر آپڑی ہے تو دفعتہً انکی زندگی کا رنگ بدل گیا ۔ انہوں نے اس طرح کسی ادنیٰ تامل کے بغیر جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کے راستے کو اپنے لیے منتخب کیا کہ گویا یہ ان کا پہلے سے سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا ۔

تختِ شاہی انہیں خاندانی طریق پر ملا تھا مگر بیعت لیتے وقت مجمع عام میں صاف کہہ دیا کہ میں اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں، تم لوگ جسکو چاہو خلیفہ منتخب کرو ۔ اور جب لوگوں نے برضا و رغبت کہا کہ ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں، تب انہوں نے خلافت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی ۔

پھر شاہانہ کروفر، فرعونی انداز، قیصر و کسریٰ کے درباری طریقے، سب رخصت کیے اور پہلے ہی روز لوازم شاہی کو ترک کر کے وہ طرز اختیار کیا جو مسلمانوں کے درمیان اُن کے خلیفہ کا ہونا چاہیے ۔

اسکے بعد ان امتیازات کی طرف توجہ کی جو شاہی خاندان کے لوگوں کو حاصل تھے اور انکو تمام حیثیتوں سے عام مسلمانوں کے برابر کر دیا ۔ وہ تمام جاگیریں جو شاہی خاندان کے قبضہ میں تھیں، اپنی جاگیر سمیت بیت المال کو واپس کیں ۔ جن جن کی زمینوں اور جائدادوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا وہ سب ان کو واپس دیں ۔ انکی اپنی ذات کو اس تغیر سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پچاس ہزار کی جگہ صرف دو سو اشرفی سالانہ کی آمدنی رہ گئی ۔۔۔۔ بیت المال کے روپے کو اپنی ذات پر اور اپنے خاندان والوں پر حرام کر دیا حتیٰ کہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تنخواہ تک نہ لی ۔ اپنی زندگی کا سارا نقشہ بدل دیا ۔ یا تو خلیفہ ہونے

سے پہلے شاہانہ شان کے ساتھ رہتے تھے۔ یا خلیفہ ہوتے ہی فقیر بن گئے۔

گھر اور خاندان کی اس اصلاح کے بعد نظام حکومت کی طرف توجہ کی۔ ظالم گورنروں کو الگ کیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر صالح آدمی تلاش کیے کہ گورنری کی خدمت انجام دیں۔ عاملین حکومت، جو قانون اور ضابطہ سے آزاد ہو کر رعایا کی جان، مال، آبرو پر غیر محدود اختیارات کے مالک ہو گئے تھے، انکو پھر ضابطہ کا پابند بنایا اور قانون کی حکومت قائم کی۔ ٹیکس عائد کرنے کی پوری پالیسی بدل دی، اور وہ تمام ناجائز ٹیکس جو شاہانِ بنی امیہ نے عائد کر دیے تھے، جن میں آبکاری تک کا محصول شامل تھا، یک قلم موقوف کیے۔ زکوٰۃ کی تحصیل کا انتظام از سر نو درست کیا اور بیت المال کی دولت کو پھر سے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ غیر مسلم رعایا کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئی تھیں اُن سب کی تلافی کی، اُن کے معابد جن پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا انہیں واپس دلائے، انکی زمینیں جو غصب کر لی گئی تھیں پھر واگذاشت کیں اور انکے تمام وہ حقوق بحال کیے جو شریعت کی رو سے انہیں حاصل ہیں۔ عدالت کو انتظامی حکومت کے دخل سے آزاد کیا اور حکم بین الناس کے ضابطہ اور اسپرٹ دونوں کو شاہی نظام کے اثرات سے پاک کر کے اسلامی اصول پر قائم کر دیا۔ اس طرح حضرت عمر ابن عبد العزیز کے ہاتھوں سے اسلامی نظام حکومت دوبارہ زندہ ہوا۔

پھر انہوں نے سیاسی اقتدار سے کام لے کر لوگوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی سے جاہلیت کے اُن اثرات کو نکالنا شروع کیا جو نصف صدی کی جاہلی حکومت کے سبب سے اجتماعی زندگی میں پھیل گئے تھے۔ فاسد عقیدوں کی اشاعت کو روکا۔ عوام کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم کی طرف اہل دماغ طبقوں کی توجہات کو دوبارہ منعطف کیا اور ایک ایسی علمی تحریک پیدا کر دی جسکے اثر سے اسلام کو ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد ابن حنبل جیسے مجتہدین میسر آئے۔ اتباع شریعت کی روح کو تازہ کیا۔ شراب نوشی، تصویر کشی اور عیش و تنعم کی بیماریاں جو شاہی نظام کی بدولت پیدا ہو چکی تھیں، ان کا انسداد کیا، اور فی الجملہ وہ مقصد پورا کیا جس کے لیے اسلام اپنی حکومت قائم کرنا

چاہتا ہے، یعنی اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ۔

بہت ہی قلیل مدت میں اس انقلابِ حکومت کے اثرات عوام کی زندگی پر اور بین الاقوامی حالات پر مترتب ہونے شروع ہو گئے۔ ایک راوی کہتا ہے کہ ولید کے زمانے میں لوگ جب آپس میں بیٹھتے تو عمارات اور باغوں کے متعلق گفتگو کرتے۔ سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ آیا تو عوام کا مذاق صنفی معاملات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر جب عمر ابنِ عبدالعزیز حکمراں ہوئے تو حالت یہ تھی کہ جہاں چار آدمی جمع ہوئے نماز اور روزہ اور قرآن کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ غیر مسلم رعایا پر اس حکومت کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہزار در ہزار آدمی اس مختصر سی مدت میں مسلمان ہو گئے اور جزیہ کی آمدنی دفعتہً اتنی گھٹ گئی کہ سلطنت کے مالیات اس سے متأثر ہو گئے۔ مملکت اسلامی کے اطراف میں جو غیر مسلم ریاستیں موجود تھیں، حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور ان میں سے متعدد ریاستوں نے اس دین کو قبول کر لیا۔ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی حریف سلطنت اس وقت روم کی سلطنت تھی جس کے ساتھ ایک صدی سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا اور اس وقت بھی سیاسی کشمکش چل رہی تھی۔ مگر عمر ابنِ عبدالعزیز کا جو اخلاقی اثر روم پر قائم ہوا اس کا اندازہ اُن الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے انتقال کی خبر سُن کر خود قیصرِ روم نے کہے تھے۔ اس نے کہا کہ:

"اگر کوئی راہب دنیا کو چھوڑ کر اپنے دروازے بند کرے اور عبادت میں مشغول ہو جائے تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ مگر مجھے حیرت ہے تو اس شخص پر جس کے قدموں کے نیچے دنیا تھی اور پھر اسے ٹھکرا کر اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔"

اسلام کے اس مجدّدِ اوّل کو صرف ڈھائی سال کام کرنے کا موقع ملا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے یہ انقلابِ عظیم برپا کر کے دکھا دیا۔ بنی امیہ کا پورا خاندان اس بندۂ خدا کا دشمن ہو گیا تھا۔ اسلام کی

زندگی میں اُن لوگوں کی موت تھی، وہ اس تجدید کے کام کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ آخر کار انہوں نے سازش کر کے زہر دیدیا اور صرف ۳۹ سال کی عمر میں یہ خادم دین وملت دنیا سے رخصت ہو گیا۔ جس کار تجدید کو اس نے شروع کیا تھا، اسکی تکمیل میں اب صرف اتنی کسر باقی تھی کہ خاندانی حکومت کو ختم کر کے انتخابی خلافت کا سلسلہ پھر سے قائم کر دیا جاتا۔ یہ اصلاح اسکے پیشِ نظر تھی، اور اپنے عندیہ کا اس نے اظہار بھی کر دیا تھا، مگر اُموی اقتدار کی جڑوں کو اجتماعی زندگی سے اکھاڑنا اور عام مسلمانوں کی اخلاقی و ذہنی حالت کو خلافت کا بار سنبھالنے کے لیے تیار کرنا اتنا آسان کام نہ تھا کہ ڈھائی برس کے اندر انجام پا سکتا۔

ائمہ اربعہ

عمر ثانی کی وفات کے بعد اگرچہ سیاسی اقتدار کی کنجیاں پھر اسلام سے جاہلیت کی طرف منتقل ہو گئیں اور سیاسی پہلو میں اُس پورے کام پر پانی پھر گیا جو انہوں نے انجام دیا تھا، مگر اسلامی ذہنیت میں جو بیداری انہوں نے پیدا کر دی تھی اور جس علمی حرکت کو وہ اُکسا گئے تھے اُسے کوئی طاقت بار آور ہونے سے نہ روک سکی۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے کوڑے اور اشرفیوں کے توڑے، دونوں ہی اسکے راستے میں حائل ہوئے، مگر کسی کی بھی اس کے آگے پیش نہ چلی۔ اس تحریک کے اثر سے قرآن و حدیث کے علوم میں تحقیق، اجتہاد اور تدوین کا بہت بڑا کام ہوا، اصولِ دین سے اسلام کے قوانین کی تفصیلی شکل مرتب کی گئی اور ایک وسیع نظام تمدن کو اسلامی طرز پر چلانے کے لیے جس قدر ضوابط و مناہج عمل کی ضرورت تھی وہ تقریباً سارے کے سارے اپنے تمام جزئیات کے ساتھ مدون کر ڈالے گئے۔ دوسری صدی کے آغاز سے تقریباً چوتھی صدی تک یہ کام پوری قوت کے ساتھ چلتا رہا۔

اس دور کے مجددین وہ چار بزرگ ہیں[1] جنکی طرف آج فقہ کے چاروں مذاہب منسوب ہیں۔ اگرچہ مجتہد انکے سوا اور بھی کثیر التعداد اصحاب تھے۔ مگر جس لحاظ سے ان حضرات کا مقام مجتہدین سے بلند ہو کر مجددین کے مرتبہ تک

[1] امام ابو حنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ امام مالک ۹۵ھ میں پیدا ہوئے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ امام شافعی ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ امام احمد ابن حنبل ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔

پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ:

اوّلاً ان حضرات نے اپنی گہری بصیرت اور غیر معمولی ذکاوت و ذہانت سے ایسے مذاہب فکر پیدا کیے جنکی زبردست طاقت سات آٹھ صدیوں تک مجتہد پیدا کرتی رہی۔ انہوں نے کلیات دین سے جزئیات مستنبط کرنے اور اصول شرع کو زندگی کے عملی مسائل پر منطبق کرنے کے ایسے وسیع و ہمہ گیر طریقے قائم کر دیے کہ آگے چل کر جس قدر اجتہادی کام ہوا انہی کے طریقوں پر ہوا اور آئندہ بھی جب کبھی اس سلسلہ میں کوئی کام ہوگا انکی رہنمائی سے انسان بے نیاز نہ ہو سکے گا۔

ثانیاً ان لوگوں نے یہ سارا کام شاہی نظام حکومت کی امداد کے بغیر، اسکی مداخلت سے بالکل آزاد ہو کر، بلکہ اسکی دراندازیوں کا سخت مقابلہ کر کے انجام دیا اور اس سلسلہ میں وہ وہ تکلیفیں اٹھائیں جنکے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے زمانہ میں کوڑوں کی مار اور قید کی سزائیں بھگتیں یہاں تک کہ زہر سے ان کا خاتمہ ہی کر دیا گیا۔ امام مالک کو منصور عباسی کے زمانے میں کوڑوں کی سزا دی گئی اور اس بری طرح انکی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا۔ امام احمد ابن حنبل پر مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانے میں مسلسل مصائب و شدائد کے پہاڑ ٹوٹتے رہے، اتنا اتنا مارا گیا کہ شاید اونٹ اور ہاتھی بھی اس مار کی تاب نہ لا سکیں، اور پھر متوکل کے زمانہ میں شاہی انعام و اکرام اور عقیدت و تعظیم کی وہ بارش ان پر کی گئی کہ گھبرا کر پکار اٹھے کہ ھذا امر اشد علی من ذالک (یہ مجھ پر اس مار اور قید سے زیادہ سخت مصیبت ہے) مگر ان سب باتوں کے باوجود ان اللہ کے بندوں نے علم دین کی ترتیب و تدوین میں نہ صرف خود شاہی نفوذ و اثر کو گھسنے کا راستہ نہ دیا بلکہ کچھ ایسی طرح ڈال گئے کہ انکے بعد بھی سارا اجتہادی و تدوینی کام درباروں کے دخل سے بالکل آزاد ہی رہا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی قوانین اور علوم حدیث و قرآن کا جتنا معتبر و مستند ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ جاہلیت کے ادنیٰ شائبہ سے بھی ملوث نہیں ہوا ہے۔ یہ چیزیں ایسی پاک صاف صورت میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئی ہیں کہ صدیوں تک بادشاہوں اور امراء کی نفس

پرستیوں اور عوام کے اخلاقی تنزل اور اعتقادی و تمدنی گمراہیوں کا جو دور دورہ رہا وہ گویا ان علوم کے لیے معدوم محض تھا۔ اس کا کوئی اثر ان علوم پر نہیں پایا جاتا۔

امام غزالی

عمر ابن عبدالعزیز کے بعد سیاست و حکومت کی باگیں مستقل طور پر جاہلیت کے ہاتھوں میں چلی گئیں، اور بنی امیہ، بنی عباس اور پھر ترکی النسل بادشاہوں کا اقتدار قائم ہوا۔ ان حکومتوں نے جو خدمات انجام دیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف یونان، روم اور عجم کے جاہلی فلسفوں کو جوں کا توں لیکر مسلمانوں میں پھیلادیا، اور دوسری طرف علوم و فنون اور تمدن و معاشرت میں جاہلیت اولیٰ کی تمام گمراہیوں کو اپنی دولت اور طاقت کے زور سے شائع و ذائع کیا۔ عباسی خاندان کے تنزل نے مزید نقصان یہ پہنچایا کہ ابتدائی عباسی خلفاء کے بعد دنیوی اقتدار کی باگیں جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئیں وہ علوم دینی سے بالکل ہی کورے تھے۔ ان میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ قضا اور افتاء کے عہدوں کے لیے اہل آدمیوں کو منتخب کر سکتے۔ اپنی جہالت اور سہولت پسندی کی وجہ سے وہ احکام شرعیہ کی تنفیذ کا کام ایسے لگے بندھے طریقوں پر کرنا چاہتے تھے جن میں کسی کدوکاوش کی ضرورت نہ ہو، اور اسکے لیے تقلید جامد ہی کا راستہ موزوں تھا۔ مزید براں دنیا پرست علماء نے انکو مذہبی مناظروں کی چاٹ بھی لگادی، اور پھر شاہی سرپرستی میں یہ مرض اتنا پھیلا کہ اس نے تمام مسلم ممالک میں فرقہ بندی، اختلاف اور سرپھٹول کی وبا پھیلادی۔

پانچویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہوگیا کہ:

(۱) یونانی فلسفے کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں۔ محدثین و فقہاء علوم عقلیہ سے ناواقف تھے اسلیے نظام دین کو مقتضائے زمانہ کے مطابق معقولی انداز سے سمجھا نہ سکتے تھے اور زجر و توبیخ سے اعتقادی گمراہیوں کو دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ علوم عقلیہ میں جن لوگوں کے کمال کا شہرہ تھا وہ نہ صرف یہ کہ علوم دینیہ میں کوئی بصیرت نہ رکھتے تھے، بلکہ فلاسفۂ یونان کے بالکل غلام تھے اور ان میں کوئی ایسا بالغ النظر

آدمی نہ تھا جو تنقید کی نگاہ سے اِس یونانی لٹریچر کا جائزہ لیتا متکلمین کا جو گروہ اسلام کی "حمایت" کے لیے اٹھا اُس نے وحی یونانی کو تو اٹل سمجھ کر جوں کا توں تسلیم کر لیا، اور وحی آسمانی کو توڑنا اور مروڑنا شروع کیا تاکہ اس کے مطابق ڈھل جائے۔ ان حالات کا عام مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ دین کو ایک غیر معقول چیز سمجھنے لگے، اسکی ہر چیز انہیں مشکوک نظر آنے لگی اور ان میں یہ خیال جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ ہمارا دین ایک چھوئی موئی کا درخت ہے جو عقلی امتحان کی ایک ذراسی ٹھیس سے مرجھا جاتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعری اور انکے متبعین نے اس رو کو بدلنے کی کوشش کی مگر یہ گروہ متکلمین کے علوم سے تو واقف تھا، لیکن معقولات کے گھر کا بھیدی نہ تھا، اسلیے وہ اس عام بے اعتقادی کی رفتار کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، بلکہ معتزلہ کی ضد میں اس نے بعض ایسی باتوں کا التزام کر لیا جو فی الواقع عقائدِ دین میں سے نہ تھیں۔

(۲) جاہل فرمانرواؤں کے اثر سے، اور علومِ دینی کو مادی وسائل کی تائید بہم نہ پہنچنے کے سبب سے اجتہاد کے چشمے خشک ہو گئے، تقلیدِ جامد کی بیماری پھیل گئی، مذہبی اختلافات نے ترقی کر کے ذرا ذرا سے جزئیات پر نئے نئے فرقے پیدا کر دیے، اور ان فرقوں کی باہمی لڑائیوں سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا علیٰ شفا حفرۃ من النار ہیں۔

(۳) مشرق سے مغرب تک مسلم ممالک میں ہر طرف اخلاقی انحطاط رونما ہو گیا جسکے اثر سے کوئی طبقہ خالی نہ رہا۔ قرآن اور نبوت کی روشنی سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی بڑی حد تک خالی ہو گئی۔ علماء، امراء، عوام، سب بھول گئے کہ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت بھی کوئی چیز ہے جسکی طرف ہدایت و رہنمائی کے لیے کبھی رجوع کرنا چاہیے۔

(۴) شاہی درباروں، خاندانوں، اور حکمراں طبقوں کی عیاشانہ زندگی اور خود غرضانہ لڑائیوں کی وجہ سے عموماً رعایا تباہ حال ہو رہی تھی۔ ناجائز ٹیکسوں کے بار نے معاشی زندگی کو نہایت خراب کر دیا تھا۔ تمدن کو حقیقی فائدہ پہنچانے والے علوم و صنائع روبہ تنزل تھے اور اُن فنون کا زور تھا جو شاہی درباروں

میں قدر و منزلت رکھتے تھے مگر اخلاق و تمدن کے لیے غارت گر تھے۔ آثار سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عام تباہی کا وقت قریب آ لگا ہے۔

یہ حالات تھے جب پانچویں صدی کے وسط میں امام غزالی پیدا ہوئے[1]۔ انہوں نے ابتداءً اسی طرز کی تعلیم حاصل کی جو اس زمانہ میں دنیوی ترقی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ انہی علوم میں کمال پیدا کیا جنکی بازار میں مانگ تھی۔ پھر اس جنس کو لیکر وہیں پہنچے جہاں کے لیے تیار ہوئے تھے اور اُن بلند ترین مراتب تک ترقی کی جن کا تصوّر اُس زمانہ میں کوئی عالم کر سکتا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ـــــ نظامیۂ بغداد ـــــ کے ریکٹر مقرر ہوئے۔ نظام الملک طوسی، ملک شاہ سلجوقی اور "خلیفۂ" بغداد کے درباروں میں اعتماد حاصل کیا۔ وقت کے سیاسیات میں یہاں تک دخیل ہوئے کہ سلجوقی فرمانروا اور عباسی "خلیفہ" کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوتے تھے ان کو سلجھانے کے لیے اِنکی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ دنیوی عروج کے اس نقطہ پر پہنچ جانے کے بعد انکی زندگی میں انقلاب رونما ہوا۔ اپنے زمانہ کی علمی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور تمدنی زندگی کو جتنی گہری نظر سے دیکھتے گئے اسی قدر اُن کے اندر بغاوت کا جذبہ ابھرتا چلا گیا، اور اسی قدر ان کے ضمیر نے زیادہ زور سے صدا لگانی شروع کی کہ تم اس گندے سمندر کی شناوری کے لیے نہیں ہو بلکہ تمہارا فرض کچھ اور ہے۔ آخر کار اُن تمام اعزازات اور فوائد و منافع اور مشاغل پر لات ماری جنکے جنجال میں پھنسے ہوئے تھے، فقیر بن کر سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے، گوشوں اور ویرانوں میں رہ کر غور و خوض کیا، چل پھر کر عام مسلمانوں کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا، اور مجاہدات و ریاضات سے اپنی روح کو صاف کرتے رہے۔ ۳۸ سال کی عمر میں نکلے تھے، پورے دس برس کے بعد ۴۸ سال کی عمر میں واپس ہوئے، اور اس طویل غور و فکر و مشاہدہ کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہوں کے تعلق اور انکی وظیفہ خواری سے توبہ کی، جدال و تعصب سے پرہیز کرنے کا دائمی عہد کیا، اُن تعلیمی ادارات میں کام کرنے سے انکار کر دیا جو سرکاری اثر میں ہوں، اور طوس میں خود اپنا ایک آزاد ادارہ قائم کیا۔ اس ادارہ میں وہ چیدہ افراد کو اپنے خاص طرز پر تعلیم و تربیت دے کر تیار کرنا چاہتے تھے، مگر غالبًا انکی یہ

[1] ۴۵۰ھ ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

کوشش کوئی بڑا انقلاب انگیز کام نہ کر سکی کیونکہ پانچ چھ سال سے زیادہ انکو اس طرزِ خاص پر کام کرنیکی اجل ہی نے مہلت نہ دی۔

امام غزالی کے تجدیدی کام کا خلاصہ یہ ہے:

اولاً، انہوں نے فلسفۂ یونان کا نہایت گہرا مطالعہ کر کے اس پر تنقید کی اور اتنی زبردست تنقید کی کہ وہ رعب جو مسلمانوں پر چھا گیا تھا، کم ہو گیا اور لوگ جن نظریات کو حقائق سمجھے بیٹھے تھے، جن پر قرآن و حدیث کی تعلیمات کو منطبق کرنیکے سوا دین کے بچاؤ کی کوئی صورت انہیں نظر نہ آتی تھی، اُنکی اصلیت سے بڑی حد تک آگاہ ہو گئے۔ امام کی اس تنقید کا اثر مسلم ممالک ہی تک محدود نہ رہا بلکہ یورپ تک پہنچا اور وہاں بھی اس نے فلسفۂ یونان کے تسلط کو مٹانے اور جدید دورِ تنقید و تحقیق کا فتح باب کرنے میں حصہ لیا۔

ثانیاً، انہوں نے ان غلطیوں کی اصلاح کی جو فلاسفہ و متکلمین کی ضد میں اسلام کے وہ حامی کر رہے تھے جو علوم عقلیہ میں گہری بصیرت نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ اُسی قسم کی حماقتیں کر رہے تھے جو بعد میں یورپ کے پادریوں نے کیں، یعنی مذہبی عقائد کے اثبات کو بعض صریح غیر معقول باتوں پر موقوف سمجھ کر خواہ مخواہ اُن کو اصول موضوعہ قرار دے لیتے اور ان کو بھی عقائدِ دین میں داخل کر کے ہر اُس شخص کی تکفیر کرتے جو ان باتوں کا قائل نہ ہو، اور ہر اس برھان یا تجربہ یا مشاہدہ کو دین کیلیے خطرہ سمجھتے جس سے اُنکے مزعومات کی غلطی ثابت ہوتی ہو۔ اسی چیز نے یورپ کو بالآخر دہریت کی طرف دھکیل دیا۔ مگر مسلم ممالک میں امام غزالی نے بروقت اسکی اصلاح کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ تمہارے عقائدِ دینی کا اثبات ان غیر معقولات کے التزام پر منحصر نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے معقول دلائل موجود ہیں، لہٰذا ان چیزوں پر اصرار فضول ہے۔

ثالثاً، انہوں نے اسلام کے عقائد اور اساسیات (Fundamentals) کی ایسی معقول تعبیر پیش کی جس پر کم از کم اُس زمانہ کے اور بعد کی کئی صدیوں تک کے معقولات کی بنا پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ احکامِ شریعت اور عبادات و مناسک کے اسرار و مصالح بھی بیان کیے اور دین کا ایک ایسا

تصور لوگوں کے سامنے رکھا جس سے وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں جنکی بنا پر پہلے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ اسلام عقلی امتحان کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔

رابعاً، انہوں نے اپنے وقت کے تمام مذہبی فرقوں اور انکے اختلافات پر نظر ڈالی اور پوری تحقیق کے ساتھ بتایا کہ اسلام اور کفر کی امتیازی سرحدیں کیا ہیں، کن حدود کے اندر انسان کے لیے رای و تاویل کی آزادی ہے، اور کن حدود سے تجاوز کرنے کے معنی اسلام سے نکل جانے کے ہیں۔ اسلام کے اصلی عقائد کون سے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جنکو خواہ مخواہ عقائد دین میں داخل کر لیا گیا ہے۔ اس تحقیقات نے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور تکفیر بازی کرنے والے فرقوں کی سرنگوں سے بہت سی باروت نکال دی اور لوگوں کے زاویۂ نظر میں وسعت پیدا کی۔

خامساً، انہوں نے دین کے فہم کو تازہ کیا، بے شعوری کی مذہبیت کو فضول ٹھیرایا، تقلید جامد کی سخت مخالفت کی، لوگوں کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے چشمۂ فیض کی طرف پھر سے توجہ دلائی، اجتہاد کی روح کو تازہ کرنے کی کوشش کی، اور اپنے عہد کے تقریباً ہر گروہ کی گمراہیوں اور کمزوریوں پر تنقید کر کے اصلاح کی طرف عام دعوت دی۔

سادساً، انہوں نے اس نظام تعلیم پر تنقید کی جو بالکل فرسودہ ہو چکا تھا اور تعلیم کا ایک نیا نظام تجویز کیا۔ اس وقت تک مسلمانوں میں جو نظام تعلیم قائم تھا اس میں دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ علوم دنیا اور علوم دین الگ الگ تھے اور اسکا نتیجہ لامحالہ تفریق دنیا و دین کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے شرعی علوم کی حیثیت سے بعض ایسی چیزیں داخل درس تھیں جو شرعی اہمیت نہ رکھتی تھیں، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دین کے متعلق لوگوں کے تصورات غلط ہو رہے تھے اور بعض غیر جنس کی چیزوں کو دینی اہمیت حاصل ہو جانے کی وجہ سے فرقہ بندیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ امام غزالی نے ان خرابیوں کو دور کر کے ایک سمویا ہوا نظام بنایا جسکی ان کے ہم عصروں نے سخت

مخالفت کی مگر بالآخر تمام مسلم ممالک میں اس کے اصول تسلیم کر لیے گئے اور جتنے نئے نظامات تعلیم بنے وہ تمام تر انہی خطوط پر بنے جو امام نے کھینچ دیے تھے۔ اس وقت تک مدارس عربیہ میں جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے اسکی ابتدائی خط کشی امام غزالی ہی کی رہینِ منت ہے۔

سابعاً، انہوں نے اخلاق عامہ کا پورا جائزہ لیا۔ انہیں علماء، مشائخ، امراء، سلاطین، عوام، سب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خوب مواقع ملے تھے۔ خود چل پھر کر مشرقی دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھ چکے تھے۔ اسی مطالعہ کا نتیجہ انکی کتاب احیاء العلوم ہے جس میں انہوں نے ہر طبقہ کی اخلاقی حالت پر تنقید کی ہے، ایک ایک برائی کی جڑ اور اسکے نفسیاتی اور تمدنی اسباب کا کھوج لگایا ہے، اور اسلام کا صحیح اخلاقی معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ثامناً، انہوں نے اپنے عہد کے نظامِ حکومت پر بھی پوری آزادی کے ساتھ تنقید کی۔ براہ راست حکام وقت کو بھی پیہم اصلاح کی طرف توجہ دلاتے رہے، اور عوام میں بھی یہ روح پھونکنے کی کوشش کی کہ منفعلانہ انداز سے جبر و ظلم کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں بلکہ آزادانہ نکتہ چینی کریں۔ احیاء میں ایک جگہ صاف لکھتے ہیں کہ "ہمارے زمانہ میں سلاطین کے تمام یا اکثر اموال حرام ہیں"۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "ان سلاطین کو نہ اپنی صورت دکھانی چاہیے، نہ انکی دیکھنی چاہیے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ انکے ظلم سے بغض رکھے، انکے بقاء کو پسند نہ کرے، انکی تعریف نہ کرے، ان کے حالات سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور انکے ہاں رسائی رکھنے والوں سے بھی دور رہے"۔ ایک اور جگہ اُن آداب پرستش و عبودیت پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں جو درباروں میں رائج تھے۔ اس معاشرت کی مذمت کرتے ہیں جو بادشاہوں اور امراء نے اختیار کر رکھی تھی۔ حتی کہ ان کے محلات، ان کے لباس، انکی آرائش، ہر چیز کو نجس بتلاتے ہیں اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے اپنے عہد کے بادشاہ کو ایک مفصل خط لکھا جس میں اس کو اسلامی طرزِ حکومت کی طرف دعوت دی، حکمرانی کی ذمہ داریاں سمجھائیں، اور اسے بتایا کہ تیرے ملک میں جو کچھ ظلم ہو رہا ہے خوا

تو خود کرے یا تیرے عمال کریں، بہرحال اسکی ذمہ داری تجھ پر ہے۔ ایک دفعہ مجبوراً دربار شاہی میں جانا پڑا تو دوران گفتگو میں بادشاہ کے منہ در منہ کہا کہ:

"تیرے گھوڑوں کی گردن ساز زریں سے نہ ٹوٹی تو کیا ہوا، مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی"۔

اسی طرح ان کے آخری زمانہ میں جتنے وزراء سلطنت کے مدبّر امر ہوئے ان سب کو بھی امام نے پیہم خطوط لکھے اور رعایا کی تباہ حالی کی طرف توجہ دلائی۔ ایک وزیر کو لکھتے ہیں:

"ظلم حد سے گذر چکا ہے۔ چونکہ مجھے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا تھا اسلیے تقریباً ایک سال سے میں نے طوس کا قیام ترک کر دیا ہے تاکہ بے رحم و بے حیا ظالموں کی حرکات دیکھنے سے خلاصی پاؤں"۔

ابن خلدون کے بیان سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت کے قیام کے خواہاں تھے جو خالص اسلامی اصول پر ہو، خواہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو۔ چنانچہ مغرب اقصیٰ میں موحدین کی سلطنت انہی کے اشارہ سے انکے ایک شاگرد نے قائم کی۔ مگر امام موصوف کے کارنامے میں یہ سیاسی رنگ محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا۔ سیاسی انقلاب کے لیے انہوں نے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں اٹھائی، نہ حکومت کے نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکے۔ اسی لیے جاہلیت کی حکمرانی میں مسلمان قوموں کی حالت برابر خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک صدی بعد تاتاری طوفان کے دروازے ان پر ٹوٹ پڑے اور اس نے انکے پورے تمدن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور رہنے کی وجہ سے اُن کے کام میں پیدا ہوئے۔ دوسری قسم اُن نقائص کی جو اُن کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے۔ اور تیسری قسم اُن نقائص کی

جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہو جانے کی وجہ سے تھے۔ ان کمزوریوں سے بچ کر امام موصوف کے اصل کام، یعنی اسلام کی ذہنی و اخلاقی روح کو زندہ کرنے اور بدعت و ضلالت کی آلائشوں کو نظامِ فکر و نظامِ تمدن سے چھانٹ چھانٹ کر نکالنے کا کام جس شخص نے انجام دیا وہ ابنِ تیمیہ تھا۔

ابنِ تیمیہ

امام غزالی کے ڈیڑھ سو برس بعد ساتویں صدی کے نصف آخر میں امام ابنِ تیمیہ پیدا ہوئے[1]۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دریائے سندھ سے فرات کے کناروں تک تمام مسلمان قوموں کو تاتاری غارت گر پامال کر چکے تھے اور شام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مسلسل پچاس برس کی ان شکستوں نے، دائمی خوف و بدامنی کی حالت نے اور علم و تہذیب کے تمام مرکزوں کی تباہی نے مسلمانوں کو اُس مرتبۂ پستی سے بھی بہت زیادہ نیچے گرا دیا تھا جس پر امام غزالی نے انہیں پایا تھا۔ نئے تاتاری حملہ آور اگرچہ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، مگر جاہلیت میں یہ حکمراں اپنے پیش رو ترکی فرمانرواؤں سے بھی کئی قدم آگے تھے۔ ان کے زیر اثر آ کر عوام اور علماء و مشائخ اور فقہاء و قضاۃ کے اخلاق اور بھی زیادہ گرنے لگے۔ تقلید جامد اس حد کو پہنچ گئی کہ مختلف فقہی و کلامی مذاہب گویا مستقل دین بن گئے۔ اجتہاد معصیت بن کر رہ گیا۔ بدعات و خرافات نے شرعی حیثیت اختیار کر لی۔ کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا ایسا گناہ ہو گیا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس دور میں جاہل و گمراہ عوام، دنیا پرست یا تنگ نظر علماء اور جاہل و ظالم حکمرانوں کی ایسی سنگت بن گئی تھی کہ اس اتحادِ ثلاثہ کے خلاف کسی کا اصلاح کے لئے اٹھنا اپنی گردن کو قصاب کی چھری کے سامنے پیش کرنے سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گو اس وقت صحیح الخیال، وسیع النظر، حقیقت شناس علماء پابند نہ تھے، نہ اُن سچے اور اصلی صوفیوں کی کمی تھی جو جادۂ حق پر گامزن تھے، مگر جس نے اس تاریک زمانہ میں اصلاح کا علم اٹھانے کی جرأت کی وہ ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔

ابن تیمیہ حدیث کے امام تھے یہاں تک کہ کہا گیا کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیہ

[1] پیدائش ۶۶۱ھ / ۱۲۶۳ء - وفات ۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء

فلیس بحدیث (جس حدیث کو ابنِ تیمیہ نہ جانتے ہوں وہ حدیث نہیں ہے)۔ تفقہ کی شان یہ تھی کہ بلاشبہ انکو مجتہد مطلق کا مرتبہ حاصل تھا۔ علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی گہری نظر تھی کہ جن لوگوں کا سرمایہ ناز یہی علوم تھے وہ اُنکے سامنے بچوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس پر جرأت وہمت کا یہ حال تھا کہ اظہار حق میں کبھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہ ڈرے، حتیٰ کہ متعدد مرتبہ جیل بھیجے گئے اور آخر کار جیل ہی میں جان دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امام غزالی کے چھوڑے ہوئے کام کو ان سے زیادہ خوبی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے تجدیدی کارنامہ کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انہوں نے یونانی منطق وفلسفہ پر امام غزالی سے زیادہ گہری اور زبردست تنقید کی اور اس کی کمزوریوں کو اس طرح نمایاں کرکے رکھ دیا کہ عقلیات کے میدان پر اس کا تسلط ہمیشہ کے لیے ڈھیلا ہو گیا۔ ان دونوں اماموں کی تنقید کے اثرات مشرق ہی تک محدود نہ رہے بلکہ مغرب تک بھی پہنچے۔ چنانچہ یورپ میں ارسطو کی منطق اور مسیحی متکلمین کے یونان زدہ فلسفیانہ نظام کے خلاف پہلی تنقیدی آواز ابنِ تیمیہ کے ڈھائی سو برس بعد اٹھی۔

(۲) انہوں نے اسلام کے عقائد، احکام، اور قوانین کی تائید میں ایسے زبردست دلائل قائم کیے جو امام غزالی کے دلائل سے زیادہ معقول بھی تھے اور اسلام کی اصلی روح کے حامل ہونے میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ امام غزالی کے بیان واستدلال پر اصطلاحی معقولات کا اثر چھایا ہوا تھا۔ ابنِ تیمیہ نے اس راہ کو چھوڑ کر عقلِ عام (Commonsense) پر تفہیم وتبیین کی بنا رکھی جو زیادہ فطری، زیادہ مؤثر اور زیادہ قرآن وسنت کے قریب ہے۔ یہ نئی راہ پچھلوں کی راہ سے بالکل الگ تھی۔ جو لوگ دین کے علمبردار تھے وہ فقط احکام نقل کر دیتے تھے، تفہیم نہ کرسکتے تھے۔ اور جو کلام میں پھنس گئے تھے وہ تفلسف اور اصطلاحی معقولات کو ذریعۂ تفہیم بنانے کی وجہ سے کتاب وسنت کی اصلی اسپرٹ کو کم وبیش کھو دیتے تھے۔ ابنِ تیمیہ نے عقائد واحکام کو انکی اصلی اسپرٹ کے ساتھ بے کم وکاست بیان بھی کیا اور

پھر تفہیم کا وہ سیدھا سادہ فطری ڈھنگ اختیار کیا جس کے سامنے اہلِ عقل کے لیے سر جھکا دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اسی زبردست کارنامے کی تعریف امام حدیث علامہ ذہبی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ ولقد نصر السنة المحضة والطريقة السلفية واحتج لها ببراهين ومقدمات وامور لم يسبق اليها۔ یعنی ابن تیمیہ نے خالص سنت اور طریقۂ سلف کی حمایت کی اور اسکی تائید میں ایسے دلائل اور ایسے طریقوں سے کام لیا جنکی طرف ان سے پہلے کسی کی نظر نہ گئی تھی۔

(۳) انہوں نے تقلید جامد کے خلاف صرف آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ قرون اولیٰ کے مجتہدین کے طریقہ پر اجتہاد کر کے دکھایا۔ براہ راست کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے استنباط کر کے، اور مختلف مذاہب فقہیہ کے درمیان آزادانہ محاکمہ کر کے، کثیر التعداد مسائل میں کلام کیا، جس سے راہ اجتہاد از سر نو باز ہوئی اور قوت اجتہادیہ کا طریق استعمال لوگوں پر واضح ہوا۔ اسکے ساتھ انہوں نے اور ان کے جلیل القدر شاگرد ابنِ قیم نے حکمت تشریع اور شارع کے طرزِ قانون سازی پر اتنا نفیس کام کیا جسکی کوئی مثال ان سے پہلے کے شرعی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ یہ وہ مواد ہے جس سے اسکے بعد اجتہادی کام کرنے والوں کو بہترین رہنمائی حاصل ہوئی اور آئندہ ہوتی رہیگی۔

(۴) انہوں نے بدعات اور مشرکانہ رسوم اور اعتقادی و اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا اور اس سلسلہ میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ اسلام کے چشمۂ صافی میں اُس وقت تک جتنی آمیزشیں ہوئی تھیں، اُس اللہ کے بندے نے ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑا، ایک ایک کی خبر لی، اور ان سب سے چھانٹ کر ٹھیٹھ اسلام کے طریقہ کو الگ روشن کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ اس تنقید و تنقیح میں اس شخص نے کسی کی رو رعایت نہ کی۔ بڑے بڑے آدمی، جنکے فضل و کمال کا اور تقدس کا سکہ مسلمانوں کی ساری دنیا پر بیٹھا ہوا تھا اور جنکے نام سن کر لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں، ابنِ تیمیہ کی تنقید سے نہ بچ سکے۔ وہ طریقے اور اعمال جو صدیوں سے مذہبی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے، جنکے جواز، بلکہ استحباب کی دلیلیں نکال لی

گئی تھیں، اور علماءِ حق بھی جن سے مداہنت کر رہے تھے، ابن تیمیہ نے انکو ٹھیٹھ اسلام کے منافی پایا اور انکی پر زور مخالفت کی۔ اس آزاد خیالی و صاف گوئی کی وجہ سے ایک دنیا انکی دشمن ہو گئی اور آج تک دشمن چلی آتی ہے۔ جو لوگ ان کے عہد میں تھے انہوں نے مقدمات قائم کر کے کئی بار جیل بھجوایا اور جو بعد میں آئے انہوں نے تکفیر و تضلیل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ مگر اسلام خالص و محض کے اتباع کا جو صور اس شخص نے پھونکا تھا اسکی بدولت ایک مستقل حرکت دنیا میں پیدا ہو گئی جسکی آواز باز گشت اب تک بلند ہو رہی ہے۔

اس تجدیدی کام کے ساتھ انہوں نے تاتاری وحشت و بربریت کے مقابلہ میں تلوار سے بھی جہاد کیا۔ اس وقت مصر و شام اس سیلاب سے بچے ہوئے تھے۔ امام نے وہاں کے عام مسلمانوں اور رئیسوں میں غیرت و حمیت کی آگ پھونکی اور انہیں مقابلہ پر آمادہ کیا۔ انکے ہم عصر شہادت دیتے ہیں کہ مسلمان تاتاریوں سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان کے مقابلہ میں جاتے ہوئے یوں ڈرتے تھے کانما یساقون الی الموت۔ مگر ابن تیمیہ نے ان میں جہاد کا جوش پھونک کر شجاعت کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کر دیا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آئیں۔

شیخ احمد سرہندی

ساتویں صدی میں فتنۂ تاتار نے ہندوکش سے اُس پار کی دنیا کو تو بالکل تاخت و تاراج کر دیا مگر ہندوستان اسکی دست بُرد سے بچ گیا تھا۔ اِس ڈھیل نے یہاں کے مترفین کو اُسی غلط فہمی میں ڈال دیا جو ہمیشہ فریفتگانِ زینتِ دنیا کو لاحق ہوتی ہے۔ یہاں وہ تمام خرابیاں پرورش پاتی رہیں جو خراسان و عراق میں تھیں۔ وہی پادشاہوں کی خداوندی، وہی امراء و اہل دولت کی عیش پسندی، وہی باطل راستوں سے مال لینا اور باطل راستوں میں خرچ کرنا، وہی جبر و ظلم کی حکومت، وہی خدا سے

غفلت اور دین کی صراطِ مستقیم سے بُعد۔ رفتہ رفتہ نوبت اکبر بادشاہ کے دورِ حکومت تک پہنچی جس میں گمراہیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں۔

اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملتِ اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی، کسی مہذب و شائستہ قوم کے لیے وہ موزوں نہیں۔ نبوت، وحی، حشر و نشر، دوزخ و جنت، ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ قرآن کا کلامِ الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی، البتہ تناسخ ہر آئینہ ممکن و اقرب الی الصواب۔ معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذاتِ نبوی پر اعتراضات کیے جاتے، خصوصاً آپ کی ازواج کے تعدد پر اور آپ کے غزوات و سرایا پر۔ یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمد سے بھی بیزاری ہو گئی اور جنکے ناموں میں یہ لفظ شامل تھا انکے نام بدلے جانے لگے دنیا پرست علماء نے اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی۔ بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجال کی نشانیاں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے، العیاذ باللہ، العیاذ باللہ۔ دیوانِ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ ابو الفضل نے نماز، روزہ، حج اور دوسرے شعائرِ دینی پر سخت اعتراضات کیے اور ان کا مذاق اڑایا۔ شعراء نے ان شعائر کی ہجو لکھی جو عوام کی زبانوں تک بھی پہنچی۔

بہائی نظریہ کی بنا بھی دراصل اکبری عہد ہی میں پڑی تھی۔ اُس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک ہزار سال گذر چکے ہیں اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی، اسلیے اب وہ منسوخ ہو گیا اور اسکی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریہ کو سکوں کے ذریعہ سے پھیلایا گیا کیونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اسکے بعد ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی جسکا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملا کر ایک مخلوط مذہب بنایا جائے تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔ دربار کے خوشامدی ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی طرف سے اس قسم کی پیشینگوئیاں

سنانی شروع کردیں کہ فلاں زمانہ میں ایک گنوار کھشک مہاتما بادشاہ پیدا ہوگا۔ اور اسی طرح بندۂ زر علماء نے بھی اکبر کو مہدی اور صاحب زمان اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک "تاج العارفین" صاحب یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسان کامل اور خلیفۃ الزماں ہونے کی حیثیت سے خدا کا عکس ہی ٹھیرا دیا۔ عوام کو سمجھانے کے لیے کہا گیا کہ "حق اور صدق (عالمگیر سچائیاں) تمام مذاہب میں موجود ہیں، کوئی ایک ہی دین حق کا اجارہ دار نہیں ہے، لہٰذا سب مذہبوں میں جو جو باتیں حق ہیں انہیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیے اور اسکی طرف لوگوں کو دعوت عام دینی چاہیے تاکہ ملتوں کے سب اختلافات مٹ جائیں، اسی طریق جامع کا نام دین الٰہی ہے۔" اس نئے دین کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے انکو "دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ ام" سے توبہ کرکے "دین الٰہی اکبر شاہی" میں داخل ہونا پڑتا تھا، اور داخل ہونے کے بعد ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر کیا جاتا۔ سلام کا طریقہ بدل کر یوں کردیا گیا کہ سلام کرنے والا "اللہ اکبر" اور جواب دینے والا جل جلالہٗ کہتا (یاد رہے کہ اکبر کا نام جلال الدین تھا)۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی اور وہ اسے پگڑی میں لگاتے۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا، اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اسکے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ علمائے کرام اور صوفیانِ باصفا، دونوں اپنے اس قبلۂ حاجات و کعبۂ مرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیۃ" اور "زمین بوسی" جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ یہ وہی ملعون حیلہ بازی تھی جسکی پیشینگوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جب لوگ حرام چیز کا نام بدل کر اسکو حلال کرلیا کرینگے۔

اس نئے دین کی بنا تو یہ کہہ کر رکھی گئی تھی کہ اس میں بلاکسی تعصب کے ہر مذہب کی اچھی باتیں لی جائینگی، مگر دراصل اس میں اسلام کے سوا ہر مذہب کی پذیرائی تھی اور نفرت و عداوت کے لیے صرف اسلام

اور اسکے احکام و قوانین ہی کو مختص کر لیا گیا تھا۔ پارسیوں سے آتش پرستی لی گئی، اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنیکے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ عیسائیوں سے ناقوس نوازی اور تماشائے صورت ثالث ثلاثہ اور اسی قسم کی چند چیزیں لی گئیں۔ سب سے زیادہ نظرِ عنایت ہندویت پر تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثر آبادی کا مذہب تھا اور بادشاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے اسکی استمالت ضروری تھی۔ چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا۔ ہندو تہوار، دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہَوَن کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام جب زبان پر آتا تو جلّت قدرتہٗ کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش و کمر پر جنیوڑالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔ معاد کے متعلق عقیدۂ تناسخ تسلیم کر لیا گیا اور برہمنوں سے انکے دوسرے بہت سے اعتقادات سیکھے گئے۔ یہ سارا معاملہ تو تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ۔ رہا اسلام تو اسکے معاملہ میں بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سی ظاہر ہوتا تھا کہ انکو اس سے ضد اور چڑ ہو گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دوسرے مذہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر ذرا فلسفیانہ و صوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی اسے وحی آسمانی سمجھ کر قبول کر لیا جاتا اور اسکے مقابلہ میں اسلامی تعلیم ٹھکرا دی جاتی۔ علمائے اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے، یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں "فقیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا جسکے معنی اُنکی اصطلاح خاص میں احمق اور ناقابلِ التفات آدمی کے ہو گئے تھے۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لیے مقرر کی گئی تھی جس میں تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری بلکہ عقیدتمندی کے ساتھ کیا جاتا تھا، مگر اسلام کا نام آتے ہی اُس کا مذاق اڑایا جانے لگتا تھا اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اسکی زبان بند کر دی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا بلکہ عملاً اسلام کے احکام میں دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ سود، جوے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر

شراب کا استعمال ضروری تھا حتی کہ قاضی و مفتی تک پی جاتے تھے۔ ڈاڑھی منڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اسکے جواز پر دلائل قائم کیے گئے۔ چچازاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع ٹھیرایا گیا۔ لڑکے کے لیے ۱۶ سال اور لڑکی کے لیے ۱۴ سال کی عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کی گئی۔ حدِ زنا نہ صرف موقوف کی گئی بلکہ چند ضوابط کے ساتھ زنا کو قانوناً جائز ٹھیرایا گیا۔ ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ختنہ کی ممانعت کردی گئی۔ ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیڑیے کو حلال کیا گیا۔ سور کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا، حتیٰ کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اسکو دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مُردوں کو دفن کرنیکے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا احسن ٹھیرایا گیا، اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلہ کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلہ ہی کی طرف پاؤں کرکے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کی مخالف تھی۔ عربی زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کے درس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا اور جو لوگ ان علوم کو حاصل کرتے وہ حقیر خیال کیے جاتے۔ علوم دینی کے بجائے حکمت و فلسفہ و ریاضی و تاریخ اور اسی نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندیت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہلِ علم ملک چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگے۔

یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے اُنکی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اسلیے وہ پرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لیے ہوئے تھے۔ اِن دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جل کر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا جس کا نام "اسلامی تمدن" تھا۔ اس میں شرک بھی تھا، نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے،

اوہام و خرافات بھی تھے، اور نو ایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی - دنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخلوطہ سے موافقت کر لی تھی، بلکہ وہ اس نئے مت کے پروہت بن گئے تھے - لوگوں کی طرف سے اُنکو نذرانے پہنچتے، اور اُنکی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا -

پیرانِ طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی - اشراقیت، رواقیت (Stoicism) اور ویدانت ازم کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہو گیا تھا جسے اسلام کے نظام اعتقادی و اخلاقی میں ٹھونس دیا گیا تھا - طریقت و حقیقت، شرع اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں - باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنا لیا گیا تھا اور اس کوچہ کا قانون یہ تھا کہ حدود حلال و حرام رخصت، احکام دین عملاً منسوخ، اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کلّی اختیارات، جس فرض کو چاہے ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے فرض بلکہ فرض الفرض بنا دے، جس حلال کو چاہے حرام کردے اور جس حرام کو چاہے حلال کردے - اِن عام پیروں سے بہتر جنکی حالت تھی ان پر بھی کم و بیش اس فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے، اور وحدت الوجود کے ایک غلط تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بیکار کر دیا تھا -

یہ حالات تھے جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے[1] - انکی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اُس دور کے صالح ترین لوگ تھے، گو اپنے گرد و پیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مگر کم از کم اپنے ایمان و عمل کو بچائے ہوئے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے - خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ صاحب سے پہنچا جو اپنے وقت کے ایک بڑے صالح بزرگ تھے - مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال تھا کہ جب حضرت موصوف کے ساتھ راہ و رسم کی ابتدا ہوئی تھی اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے کہ:

---

[1] پیدائش ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء - وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء -

"حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ اسکی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اِس دوران میں اُس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا اُسکی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دیگا۔"

یہ پیشینگوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے حق پرست علماء اور سچے صوفیہ بھی اُس وقت موجود تھے، مگر ان سب کے درمیان وہ اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لیے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیاءِ دین کی جدوجہد کی۔ اس بے سروسامان فقیر نے علی الاعلان اٹھ کر ان گمراہیوں کی مخالفت کی جنہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی، اور اُس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت نے اس کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی حتیٰ کہ جیل بھی بھیجا، مگر بالآخر وہ فتنہ کا منہ پھیر دینے میں کامیاب ہو گیا۔ جہانگیر، جس نے سجدۂ تحیۃ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں بھیج دیا تھا، آخر میں شیخ کا معتقد ہو گیا اور اپنے بیٹے خرم کو، جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا، اُن کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاندانہ روش احترام سے بدل گئی۔ "دینِ الٰہی اکبرشاہی" اُن تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھیں۔ اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی وہ خود منسوخ ہو گئی۔ حکومت اگرچہ شاہی حکومت ہی رہی، مگر کم از کم اتنا ہوا کہ علوم دینی اور احکام شرعی کی طرف اُس کا رویہ کافرانہ ہونے کے بجائے عقیدت مندانہ ہو گیا۔ شیخ کی وفات کے تین چار ہی سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جنکی بدولت تیموری خاندان کے اُس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادمِ شریعت کا پرپوتا خادمِ شریعت ہوا۔

شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں

چلے جانے سے روکا اور اس فتنۂ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا جو اب سے تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام و نشان مٹا دیتا۔ اسکے علاوہ انہوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دیے۔ ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو اُن آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے اُس میں سرایت کر گئی تھیں، پاک کر کے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا۔ دوسرے یہ کہ اُن تمام رسوم جاہلیت کی شدید مخالفت کی جو اُس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں اور سلسلۂ بیعت و ارشاد کے ذریعہ سے اتباعِ شریعت کی ایک ایسی تحریک پھیلائی جسکے ہزارہا تربیت یافتہ کارکنوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں میں، بلکہ وسط ایشیا تک پہنچ کر عوام کے اخلاق اور عقائد کی اصلاح کے لیے کوشش کی۔ یہی کام ہے جسکی وجہ سے شیخِ سرہندی کا شمار مجددین ملت میں ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ۴۰ سال بعد اور عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوئے[له]۔ ایک طرف اُنکے زمانہ اور ماحول کو اور دوسری طرف اُنکے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اِس نظر، اِن خیالات اِس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمدشاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا اِس تاریک زمانہ میں نشو و نما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظرِ عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے، تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلۂ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے، اور ایسا لٹریچر چھوڑ کر جاتا ہے جسکی زبان، اندازِ بیان، خیالات، نظریات، مواخذ تحقیق اور نتائج مستخرجہ، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ اسکے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اُس جگہ لکھی گئی تھیں جسکے گرد و پیش عیاشی، نفس پرستی، قتل و

له پیدائش ۱۱۱۴ھ ۱۷۰۳ء - وفات ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۲ء -

غارت، جبر و ظلم اور بدامنی و طوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔

شاہ صاحب تاریخ انسانی کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی ایک صاف، سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں حالاتِ موجودہ کے خلاف ایسی بے چینی، اور تعمیر نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کر کے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریبِ فاسد و تعمیر صالح کے لیے ایک تحریک اٹھتی ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے مطابق خود کوئی عملی تحریک اٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے نئی دنیا بنانے کے لیے میدان میں نکل آتے ہوں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ اس طرز کے لیڈروں کا اصلی کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تنقید سے صدہا برس کی جمی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار چھانٹ دیتے ہیں، ذہن میں نئی روشنی پیدا کرتے ہیں، زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ بنے ہوئے سانچے کو عالمِ ذہنی میں توڑتے ہیں اور اس کے ملبے میں سے اصلی اور پائدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں۔ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی مشغولیتوں سے آدمی کو اتنی فرصت مشکل ہی سے مل سکتی ہے کہ خود میدان میں آکر تعمیر کا عملی کام بھی کر سکے۔ اگرچہ شاہ صاحب تفہیماتِ الٰہیہ میں ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں کہ اگر موقع و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت بھی رکھتا تھا۔[1] مگر واقعہ یہی ہے کہ انہوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خیالات کی دنیا میں ان کا انہماک اتنا بڑھا ہوا تھا کہ خود اُن کے اپنے گھر اور اُن کے قریبی حلقہ

---

[1] تفہیمات جلد اول ص ۱۰۱: فلو فرض ان یکون ھذا الرجل فی زمان واقتضت الاسباب ان یکون اصلاح الناس باقامۃ الحروب ونفث فی قلبہ اصلاحھم لقام ھذا الرجل بامر الحرب اتم قیام وکان اماما فی الحرب لا یقاس بالرستم والاسفندیار بل الرستم والاسفندیار وغیرھما طفیلیون علیہ مستمدون منہ مقتدون بہ۔

میں بہت سے غیر اسلامی طریقے رائج تھے اور وہ انکی اصلاح پر بھی توجہ صرف کرنے سے معذور رہے۔ مثلاً السلام علیکم تک کا رواج اُنکے گھر میں نہ تھا۔ "رفیع الدین آداب بجالاتا ہے"، "عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے" سلام مسنون کے بجائے اس قسم کے فقرے بولے جاتے تھے۔ شاہ صاحب کی پوتی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی جوان بیوہ بیٹھی ہوئی تھیں اور نکاح ثانی میں انہیں اسلیے تامل تھا کہ ہندوانہ جاہلیت اِسے معیوب سمجھتی تھی۔ بی بی کی صحنک اور اسی قسم کی نیازوں کا سلسلہ خود اس خاندان کی خواتین میں جاری تھا۔[1] یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شاہ صاحب کی ساری قوتوں کو تنقید و تعمیر افکار کے بھاری کام نے بالکل اپنے اندر جذب کر رکھا تھا اور انکو اس کارِ عظیم سے اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ اپنے قریب ترین ماحول کی طرف ہی توجہ کر سکتے۔ جیسا کہ آگے چل کر عرض کیا جائیگا، اُن کے صاف کیے ہوئے راستہ پر عملی جدوجہد کرنے کے لیے کچھ دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی، اور وہ نصف صدی کے اندر خود انہی کے حلقۂ تعلیم و تربیت سے نشو و نما پا کر اٹھے۔

شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامے کو ہم دو بڑے عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک عنوان تنقید و تنقیح کا، اور دوسرا عنوان تعمیر کا۔ میں ان دونوں کو الگ الگ بیان کرونگا۔

---

[1] مولانا محمد منظور صاحب مدیر "الفرقان" نے مجھے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شاہ صاحب اور انکے خاندان کے متعلق یہ روایات کچھ زیادہ معتبر نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیانات یا ان میں سے اکثر غلط ہوں۔ مجھے اِن کے صحیح ہونے پر اصرار نہیں ہے۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ بجائے خود حقیقت ہے۔ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ساری زندگی اس پر شاہد ہے کہ وہ تمام عمر تنقیح و تنقید اور تعمیر افکار کے کام میں منہمک رہے اور دعوتِ عامہ کی طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ تطہیر و تعمیر فکر اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کام ہے۔ اور دعوتِ عامہ کا کام اس سے مختلف ایک دوسری نوعیت کا کام ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ دونوں کام ایک ساتھ انجام دے سکے۔ اور اگر کسی شخص نے صرف پہلا کام کیا ہو اور دوسرا کام نہ کر سکا ہو تو اس سے اسکی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

کے نتائج کو بھی جس صراحت کے ساتھ انہوں نے پیش کیا ہے وہ اگلوں کے کلام میں مفقود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ارکان اسلام کی اقامت میں فتور عظیم برپا ہو گیا... حضرت عثمان کے بعد کسی فرمانروا نے حج قائم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے نائب ہی مقرر کر کے بھیجتے رہے، حالانکہ اقامتِ حج خلافت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور شاہانِ گذشتہ کی شہ نشین میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کے لیے علامت پادشاہی تھا اسی طرح حج خود اپنی امارت میں قائم کرنا اسلام میں علامتِ خلافت ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"پہلے وعظ اور فتویٰ دونوں خلیفہ کی رائے پر موقوف تھے۔ خلیفہ کی اجازت کے بغیر نہ وعظ کہا جا سکتا تھا اور نہ کوئی شخص فتویٰ دینے کا مجاز تھا۔ مگر اس انقلاب کے بعد وعظ اور فتویٰ دونوں اس نگرانی سے آزاد ہو گئے بلکہ بعد میں تو فتویٰ دینے کے لیے جماعت صالحین کے مشورے کی قید بھی نہ رہی۔"

پھر فرماتے ہیں:

"اِن لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند رہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں۔ ہم اسی تغیر کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں، معلوم نہیں آگے چل کر خدائے تعالیٰ کیا دکھانا چاہتا ہے۔"

رہی دوسری خرابی تو شاہ صاحب نے ازالہ میں، حجت میں، بدور بازغہ میں، تفہیمات میں، مسوّیٰ اور مصفّیٰ میں، اور قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اس پر ماتم کیا ہے۔

ازالہ میں فرماتے ہیں:۔

"دولتِ شام (اموی سلطنت) کے خاتمہ تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہ کہتا تھا،

بلکہ سب اپنے اپنے ائمہ اور اساتذہ کے طریقہ پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے۔ دولتِ عراق (عباسی سلطنت) کے زمانہ میں ہر ایک نے اپنا ایک نام معین کیا اور یہ کیفیت ہو گئی کہ جب تک اپنے مذہب کے بڑوں کی نص نہ پاتے کتاب و سنت کی دلیل پر حکم نہ کرتے اس طرح وہ اختلافات جو ادلِ کتاب و سنت کے مقتضا سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے، مضبوط بنیادوں پر جم گئے۔ پھر جب دولتِ عرب کا خاتمہ ہو گیا (یعنی ترکی اقتدار کا زمانہ آیا) اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہوئے تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے یاد کیا تھا اُسی کو اصل بنا لیا۔ پہلے جو چیز مذہبِ مستنبط تھی اب وہ سنت مستقرہ بن گئی۔ اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں اور تفریع پر تفریع۔"

مصفّٰی میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے زمانہ کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔ اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ اِن کا کاروبار ہی دوسرا ہے۔ یہ بیچارے ان امور کی سمجھ بوجھ کے لیے مکلّف ہی نہیں ہیں۔"

حجت کے مبحث ہفتم میں اور انصاف میں شاہ صاحب نے اس مرض کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ان خرابیوں کی نشان دہی کی ہے جو اسکی بدولت پیدا ہوئیں۔

تاریخی تنقید کے بعد شاہ صاحب اپنے زمانہ کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک گروہ کو نام بنام پکار کر اسکے نقائص بیان کرتے ہیں۔ تفہیمات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہ وصی (یعنی خود شاہ صاحب) ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جبکہ لوگوں میں تین چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں:

(۱) دلیل بازی اور یہ یونانی علوم کے اختلاط کی بدولت ہے۔ لوگ کلامی مباحث

میں مشغول ہو گئے ہیں یہاں تک کہ عقائد میں کوئی گفتگو ایسی نہیں ہوتی جو استدلالی مناظرات سے خالی ہو۔

(۲) وجدان پرستی، اور یہ صوفیوں کی مقبولیت اور انکی حلقہ بگوشی کی وجہ سے ہے جس نے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو گھیر رکھا ہے، یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں۔ انکے رموز و اشارات اس قدر دخل پا گئے ہیں کہ جو شخص ان رموز و اشارات کا انکار کرے یا ان سے خالی ہو وہ نہ مقبول ہوتا ہے، نہ صالحین میں شمار ہوتا ہے۔ منبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جسکی تقریر اشارات صوفیہ سے پاک ہو، اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں اعتقاد اور غور و خوض کا اظہار نہ کرے، ورنہ اس کا شمار گمراہوں میں ہونے لگتا ہے۔ پھر امرا و روٴسا وغیرہ کی کوئی مجلس ایسی نہیں جنکے ہاں لطف کلام اور بذلہ سنجی اور تفنن طبع کے لیے صوفیہ کے اشعار اور نکات کھلونا بنے ہوئے نہ ہوں۔

(۳) طاعت، اور یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ ملت اسلامیہ میں داخل ہیں۔

پھر اس زمانہ کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور بگ ٹٹ چلا جا رہا ہے، نہ متشابہات پر جا کر رکتا ہے اور نہ کسی ایسے امر میں دخل دینے سے باز رہتا ہے جو اسکے علم سے بالاتر ہو۔ احکام کے معانی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کلام کر رہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظرہ و مباحثہ کر رہا ہے۔ دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنفی، شافعی وغیرہم کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے طریقہ پر اعتراض کرتا ہے۔ ہر مذہب میں تخریجات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ

گیا ہے"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"میں ان پیرزادوں سے، جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں، کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقہ پر چل رہا ہے اور کیوں اُس طریقہ کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا تھا؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے، اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے آپ کو ہادی و مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں ہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں، یا اسلیے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراض دنیوی حاصل کریں، یا لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفس کی اطاعت ان سے کراتے ہیں۔ یہ سب رہزن ہیں، دجال ہیں، کذاب ہیں، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں ....

میں اُن طالبانِ علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے، حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے، یا وہ سنت ہے جو رسول سے ثابت ہو ...... تم پچھلے فقہاء کے استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اسکے رسول نے فرمایا ہو؟ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ یہ پیش کرتا ہے کہ صاحب حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو

کاملین و ماہرین کا کام ہے، اور یہ حدیث ائمۂ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہو گی، پھر کوئی وجہ تو ہو گی کہ انہوں نے اسے ترک کر دیا۔ جان رکھو کہ یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف......

میں ان متقشف واعظوں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلق خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا حالانکہ تم فراخی کے لیے مامور تھے نہ کہ تنگی کے لیے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار علیہ بنا لیا ہے حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں، لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں۔.....

میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو گئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے۔ علانیہ شرابیں پی جا رہی ہیں اور تم نہیں روکتے۔ زنا کاری، شراب خواری اور قمار بازی کے اڈے بر سرِ عام بن گئے ہیں اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں مدتہائے دراز سے کوئی حدِ شرعی نہیں لگائی گئی۔ جس کو تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو۔ کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو۔ کبھی خدا کا خیال تمہیں نہیں آتا......

میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو تو اللہ نے جہاد کے لیے، اعلائے کلمۂ حق کے لیے، شرک و اہلِ شرک کا زور توڑنے کے لیے بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ

سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنالیا - اب جہاد کی نیت اور قصد سے تمہارے دل خالی ہیں۔
پیسہ کمانے کے لیے سپاہی گری کا پیشہ کرتے ہو - بھنگ اور شراب پیتے ہو - ڈاڑھیاں
منڈاتے اور مونچھیں بڑھاتے ہو - بندگانِ خدا پر ظلم ڈھاتے ہو - اور تمہیں کبھی اس بات کی
پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کما رہے ہو یا حلال کی - خدا کی قسم تمہیں ایک روز دنیا سے
جانا ہے، پھر اللہ تمہیں بتائیگا کہ کیا کر کے آئے ہو - ......

میں ان اہلِ حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم میں سے امانت و دیانت رخصت ہو گئی
ہے، اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو، اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو - تم
غیر اللہ کے لیے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے
ہو - یہ تمہارے بدترین افعال ہیں - تم میں سے جو کوئی خوشحال ہو جاتا ہے وہ اپنے لباس
اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اسکی آمدنی اسکے لیے کافی نہیں ہوتی اور اہل و عیال
کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے، یا پھر وہ شراب نوشی اور کرایہ کی عورتوں میں اپنی معاش اور
معاد دونوں کو ضائع کرتا ہے - ......

پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے
اپنے اخلاق کھو دیے، تم پر تنگ دلی چھا گئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا - عورتیں مردوں
پر حاوی ہو گئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے - حرام میں تمہیں مزا آتا
ہے اور حلال تمہارے لیے بدمزہ بن گیا ہے - .... اے بنی آدم! تم نے
ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے - مثلاً روزِ عاشورا کو تم جمع
ہو کر باطل حرکات کرتے ہو - ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے - کیا تم نہیں
جانتے کہ سب دن اللہ کے ہیں اور سارے حوادث اللہ کی مشیت سے ہوتے ہیں؟ اگر حسین

رضی اللہ عنہ اس روز شہید کیے گئے تو اور کونسا دن ہے جس میں کسی محبوبِ خدا کی موت واقع نہ ہوئی ہو؟ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنالیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے۔ اگر تم سچے ہو تو اپنے اس خیال اور ان حرکات کے لیے کوئی دلیل لاؤ۔ پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے، مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کو ممنوع بنا لینا، بیوہ عورت کو بٹھار کھنا۔ اس قسم کی رسموں میں تم اپنے مال اور اپنی زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور ہدایت صالحہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے، حالانکہ بہتر یہ تھا کہ ان رسموں کو چھوڑ کر اُس طریقہ پر چلتے جس میں سہولت تھی نہ کہ تنگی۔ پھر تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے، گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اُسکے اقربا خوب کھانے کھلائیں۔ تم نمازوں سے غافل ہو، کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لیے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے۔ تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو، تم میں کوئی مالدار ایسا نہیں جسکے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں، وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا۔ تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اسکے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔ تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناصب پر کر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لیے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں...... "

ایک ، اور تفہیم میں فرماتے ہیں :-

"جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لیے اجمیر یا سالار مسعود کی قبر یا ایسے ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا گناہ اس سے کم تر ہے آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں فرق کیا ہے؟ جو لوگ لات اور عُزّیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے اُن کا فعل اِن لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اُنکے برعکس اِن لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ خاص اِن کے معاملہ میں شارع کی نص موجود نہیں ہے - مگر اصولاً ہر وہ شخص جو کسی مُردے کو زندہ ٹھیرا کر اُس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اُس کا دل گناہ میں مبتلا ہے"

یہ اقتباسات بہت طویل ہو گئے ہیں ، مگر تفہیمات جلد دوم کے چند فقرے اور تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کو بھی اس سلسلہ میں ناظرین تک پہنچا دیا جائے - فرماتے ہیں :-

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کر لو گے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے وہاں تم بھی قدم رکھو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی اُنکے پیچھے جاؤ گے - صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ پہلی امتوں سے آپکی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ حضور نے فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے -

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے - ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنا لیا ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے - ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلام

شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں اور گناہگار میرے لیے۔ یہ اُسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (ہم دوزخ میں نہ جائیںگے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لیے)۔ سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے، بخصوصاً مسئلۂ توحید میں۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انہیں بالکل پروا نہیں ہے۔ فقہاء کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جنکے ماخذ کا پتہ ہی نہیں، مثلاً دہ در دہ کا مسئلہ[1] اور کنوؤں کی طہارت کا مسئلہ[2]۔ رہے اصحابِ معقول اور شعراء اور اصحابِ ثروت اور عوام تو ان کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔"

ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور کس قدر جامعیت کے ساتھ اُن پر تنقید کی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جنکے ضمیر و ایمان میں زندگی اور جنکے قلب میں برے اور بھلے کی تمیز ہوتی ہے، ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے۔ انکی اسلامی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر انہیں کھٹکنے لگتا ہے۔ انکی قوتِ امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو تحلیل کرنے لگتے ہیں۔ اور انکی قوتِ ایمانی اس قدر بیدار ہو جاتی ہے کہ خار زار جاہلیت کی ہر کھٹک انہیں

[1] یعنی یہ مسئلہ کہ دس ہاتھ لمبا دس ہاتھ چوڑا حوض ہو تب اس کا پانی ماءِ کثیر ہوگا۔

[2] یعنی یہ مسئلہ کہ کنویں میں کس جانور کے گرنے پر کتنے ڈول پانی کے نکالے جائیں۔

اصلاح کے لیے بے چین کر دیتی ہے۔ اسکے بعد مجدد کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے، اُس پر وہ اپنی نظر جما سکیں اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں۔ یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اُسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا جو اُنکے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔

تعمیر کے سلسلہ میں ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ وہ فقہ میں ایک نہایت معتدل مسلک پیش کرتے ہیں جس میں کسی ایک مذہب کی جانب داری اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ ایک محقق کی طرح انہوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے اصول اور طریق استنباط کا مطالعہ کیا ہے اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے۔ جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید کی، اس بنا پر کی کہ دلیل اسکے حق میں پائی، نہ اس بنا پر کہ وہ اس مذہب کی وکالت کا عہد کر چکے ہیں۔ اور جس سے اختلاف کیا، اس بنا پر کیا کہ دلیل اس کے خلاف پائی، نہ اس بنا پر کہ اُنہیں اُس سے عناد ہے۔ اسی وجہ سے کہیں وہ حنفی نظر آتے ہیں، کہیں شافعی، کہیں مالکی اور کہیں حنبلی۔ انہوں نے اُن لوگوں سے بھی اختلاف کیا ہے جو ایک مذہب کی پیروی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں اور قسم کھا لیتے ہیں کہ تمام مسائل میں اسی کا اتباع کرینگے۔ اور اسی طرح وہ اُن سے بھی سخت اختلاف کرتے ہیں جنہوں نے ائمۂ مذاہب میں سے کسی کی مخالفت کا عہد کر لیا ہے۔ ان دونوں کے بین بین وہ ایک ایسے معتدل راستہ پر چلتے ہیں جس میں ہر غیر متعصب طالب حق کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کا رسالہ انصاف اس مسلک کا آئینہ ہے۔ یہی رنگ مصفیٰ اور انکی دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ تفہیمات میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اسکی تفصیل یہ ہے کہ ابو حنیفہ اور شافعی کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی انہی دونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں۔ فقہاء، محدثین، مفسرین

متکلمین اور صوفیہ زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں۔ اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے متبع ہیں۔ اس وقت جو امرِ حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیثِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو وہ باقی رکھا جائے اور جسکی کوئی اصل نہ ملے اسے ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس لائق ہیں کہ انہیں دانتوں سے پکڑ لیا جائے۔ اور اگر ان میں دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کیے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے۔ یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسی قرآن میں اختلافِ قرأت کی حیثیت ہے، یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا، یا کسی مخمصہ سے نکلنے کے دو راستوں کی سی نوعیت ہوگی جیسے تعددِ کفّارات، یا دو برابر کے مباح طریقوں کا سا حال ہوگا۔ اِن چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو انشاء اللہ تعالیٰ نہ پایا جائیگا۔"

انصاف میں انہوں نے اپنی رائے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ دی ہے چنانچہ باب ۴ میں واعلم ان التخریج علی کلام الفقہاء سے لیکر آخر باب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اہل الحدیث اور اہلِ تخریج دونوں اسکو غور کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس بحث میں انہوں نے جس طریقہ کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ طریق اہل حدیث اور طریق اہل تخریج، دونوں کو جمع کیا جائے۔ اسی طرح حجت کے مبحث ہفتم میں فصل ومما یناسب ھذا المقام التنبیہ علی مسائل ضلت فی بوادیھا الافہام کے تحت جو بحث کی ہے وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ مسلکِ معتدل اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری اور تقلیدِ جامد اور لاطائل

بحثوں میں تضیع اوقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وسعتِ نظر کے ساتھ تحقیق و اجتہاد کا راستہ کھلتا ہے۔ چنانچہ اسکے ساتھ ہی شاہ صاحب اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اور قریب قریب انکی تمام کتابوں میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح تحقیق و اجتہاد پر اُکسایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مصفیٰ کے مقدمہ سے چند فقرے انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

"اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است۔ و مراد از اجتہاد اینجا ...... معرفت احکام شرعیہ از ادلہ تفصیلیہ و تفریع و ترتیب مجتہدانہ اگرچہ بارشاد صاحبِ مذہبے بودہ باشد۔ و آنکہ گفتیم اجتہاد در ہر عصر فرض است، بجہت آنست کہ مسائل کثیرة الوقوع غیر محصور اند، و معرفت احکام الٰہی در انہا واجب، و آنچہ مسطور و مدون شدہ است غیر کافی، و در انہا اختلاف بسیار کہ بدون رجوع بادلہ حلِ اختلافِ آں نتواں کرد، و طُرُقِ آں تا مجتہدین غالباً منقطع، پس بغیر عرض بر قواعدِ اجتہاد راست نیاید"۔

یہی نہیں کہ شاہ صاحب نے اجتہاد پر محض زور ہی دیا ہو، بلکہ انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اجتہاد کے اصول و قواعد اور اسکی شرائط کو بیان بھی کیا ہے۔ ازالہ، حجت، عقد الجید، انصاف، بدور بازغہ، مصفیٰ وغیرہ میں اس مسئلہ پر کہیں اشارات اور کہیں مفصل تقریریں موجود ہیں۔ نیز اپنی کتابوں میں جہاں بھی انہوں نے کسی مسئلہ پر گفتگو کی ہے ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت سے کی ہے، گویا اُن کی کتابوں کے مطالعہ سے آدمی کو نہ صرف اجتہاد کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ اسکی تربیت بھی مل جاتی ہے۔

مذکورۂ بالا دو کام تو ایسے ہیں جو شاہ صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے کیے ہیں، مگر جو کام اُن سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیش رووں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے ائمہ گذرے ہیں جنکے کام کو دیکھنے

سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں، اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں جنکے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں۔ انکی کتابوں میں سے حجۃ اللہ اور البدور البازغہ، دونوں کا موضوع یہی ہے پہلی کتاب زیادہ مفصل ہے اور دوسری زیادہ فلسفیانہ۔

ان کتابوں میں انہوں نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتدا کی ہے، اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص فلسفۂ اسلام کو مدون کرنے کی بنا ڈال رہا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان فلسفہ میں جو کچھ لکھتے اور کہتے رہے اس کو محض نادانی سے لوگوں نے "فلسفۂ اسلام" کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ فلسفۂ اسلام نہیں، فلسفۂ مسلمین ہے جس کا شجرۂ نسب یونان و روم اور ایران و ہندوستان سے ملتا ہے۔ فی الواقع جو چیز اس نام سے موسوم کرنے کے لائق ہے اسکی داغ بیل سب سے پہلے اسی دھلوی شیخ نے ڈالی ہے۔ اگرچہ اصطلاحات وہی قدیم فلسفہ و کلام یا فلسفیانہ تصوف کی زبان سے لی ہیں، اور غیر شعوری طور پر بہت سے تخیلات بھی وہیں سے آ گئے ہیں، جیسا کہ اول اول ہر نئی راہ نکالنے والے کے لیے طبعاً ناگزیر ہے، مگر پھر بھی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولنے کی یہ ایک بڑی زبردست کوشش ہے، خصوصاً ایسے شدید انحطاط کے دور میں اتنی طاقتور عقلیت کے آدمی کا ظاہر ہونا بالکل حیرت انگیز ہے۔

اس فلسفہ میں شاہ صاحب کائنات کا اور کائنات میں انسان کا ایک ایسا تصور قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اسلام کے نظام اخلاق و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ و متحد المزاج ہو سکتا ہو، یا دوسرے الفاظ میں جس کو اگر شجرۂ اسلام کی جڑ قرار دیا جائے تو جڑ میں، اور اُس درخت میں جو اس سے پھوٹتا،

عقلاً کوئی فطری مباینت محسوس نہ کی جاسکتی ہو ۔ میں حیران رہ جاتا ہوں جب سنتا ہوں کہ شاہ صاحب نے ویدانتی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا جوڑ لگا کر نئی ہندی قومیت کے لیے فکری اساس فراہم کرنے کی کوئی کوشش کی تھی ۔ مجھے ان کی کتابوں میں اس کوشش کا کہیں سراغ نہ ملا ۔ اور اگر مل جاتا تو باللہ العظیم کہ میں شاہ صاحب کو مجددین کی فہرست سے خارج کر کے متجددین کی صف میں لے جا کر بٹھاتا ۔

مابعد الطبیعی بنیاد کو استوار کرنے کے بعد وہ اس پر ایک نظام اخلاق مرتب کرتے ہیں اور اس مقام پر انتہائی جذبۂ اعتراف کے ساتھ میں دیکھتا ہوں کہ وہ یونانی ایتھکس کی غلامی سے پہلو بچا رہے ہیں ، اُس ایتھکس کی غلامی سے جس میں دوّانی جیسے لوگ جا پھنسے اور جس کا اچھا خاصا اثر امام غزالی تک کے ذہن پر قائم رہا ۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب اس ایتھکس کے اثر سے بالکل آزاد ہو چکے تھے ۔

نظام اخلاق پر وہ ایک اجتماعی فلسفہ (Social philosophy) کی عمارت اٹھاتے ہیں جس کے لیے انہوں نے ارتفاقات کا عنوان تجویز کیا ہے ، اور اس سلسلہ میں تدبیر منزل ، آداب معاشرت ، سیاست مدن ، عدالت ، ضرب محاصل (Taxation) ، انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں ، اور ساتھ ہی اُن اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے ۔

پھر وہ نظام شریعت ، عبادات ، احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں ۔ اس خاص مضمون پر جو کام انہوں نے کیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا ، اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں ۔

---

[1] جو فلسفہ مسلمانوں میں رائج تھا وہ اسلام کے عملی ، اخلاقی اور اعتقادی نظام سے کوئی ربط نہ رکھتا تھا ، اس وجہ سے اس کا رواج جتنا جتنا بڑھا اسی قدر مسلمانوں کی زندگی بگڑتی چلی گئی ، عقیدہ بھی کمزور ہوا ، اخلاق بھی ڈھیلے ہوئے اور قوائے عمل بھی سرد ہو گئے ۔ ذہن میں متصادم خیالات کی کشمکش کا یہ طبیعی نتیجہ ہے ۔ اور یہی اثر اب موجودہ مغربی فلسفہ کے رواج سے بھی رونما ہو رہا ہے ، کیونکہ وہ بھی کسی طرح نظام اسلامی کی فکری اساس نہیں بن سکتا ۔

آخر میں انہوں نے تاریخ ملل و شرائع پر بھی نظر ڈالی ہے اور کم از کم میرے علم کی حد تک وہ پہلے شخص ہیں جس نے اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا ایک دھندلا سا تصور پیش کیا ہے۔

نظام اسلامی کے اس قدر معقول اور اتنے مرتب خاکے کا پیش ہو جانا بجائے خود اس امر کی پوری ضمانت ہے کہ وہ تمام صحیح الفطرت اور سلیم الطبع لوگوں کا نصب العین بن جائے، اور جو لوگ اُن میں سے زیادہ قوتِ عمل رکھتے ہوں وہ اس نصب العین کے لیے جان و تن کی بازی لگا دیں، خواہ اس نصب العین کو سامنے رکھنے والا خود عملاً ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرے یا نہ کرے۔ مگر جو چیز اس سے بھی زیادہ محرک ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ شاہ صاحب نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیا، اور نہ صرف اسلامی حکومت کی خصوصیات صاف صاف بیان کیں، بلکہ اس بحث کو بتکرار ایسے طریقوں سے پیش کیا جنکی وجہ سے اصحاب ایمان کے لیے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد کیے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہو گیا۔ یہ مضمون حجت میں بھی کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، مگر ازالہ تو گویا ہے ہی اسی موضوع پر۔ اس کتاب میں وہ احادیث سے ثابت کرتے ہیں کہ خلافت اسلامی اور بادشاہی، دو بالکل مختلف الاصل چیزیں ہیں۔ پھر ایک طرف بادشاہی کو اور ان تمام فتنوں کو رکھتے ہیں جو بادشاہی کے ساتھ مسلمانوں کی حیات اجتماعی میں از روئے تاریخ پیدا ہوئے، اور دوسری طرف خلافت اسلامی کی خصوصیات اور شرائط کو اور اُن رحمتوں کو پیش کر دیتے ہیں جو اسلامی خلافت میں فی الواقع مسلمانوں پر نازل ہو چکی ہیں۔ اسکے بعد کس طرح ممکن تھا کہ لوگ چین سے بیٹھ جاتے۔

سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید

یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات[1] اور شاہ شہیدؒ کی منصب امامت، عبقات

[1] سید صاحب ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء (۸۷) میں شہادت پائی۔ شاہ اسماعیل صاحب ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ انقلابی تحریک کی چنگاری سید صاحب کے دل میں غالباً ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ زمانے ہی میں بھڑک اٹھی تھی۔

تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئیگی۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کردی، اور پھر ان کے چاروں صاحبزادوں نے، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو بہت زیادہ وسیع کیا، یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جنکے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کیے ہوئے تھے، جنکے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی، اور جو اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور انکے حلقہ کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے۔ اس چیز نے اُس تحریک کے لیے گویا زمین تیار کردی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقہ سے، بلکہ یوں کہیے کہ انکے گھر سے اٹھنے والی تھی۔

سید صاحب اور شاہ صاحب دونوں روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں، اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدّد نہیں سمجھتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کے کارنامے کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انہوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرام کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

(۲) انہوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سر تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہوسکتا تھا، جہاد کی تیاری کی، اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کردیا۔ پھر غایت تدبّر کے ساتھ آغاز کار کے لیے شمالی مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہوسکتا تھا۔

پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے، اور اس طرح انہوں نے صحیح معنوں میں روح اسلامی کا پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے مظاہرہ کر دیا۔ ان کی جنگ ملک و مال یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ انکے سامنے کوئی مقصد اسکے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمام حجت کر کے تلوار اٹھائی۔ اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔ انکی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی، نہ انکی چھاؤنی بدکاریوں کا اڈا بنتی تھی، اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ انکی فوج کسی علاقے سے گذری ہو اور اس علاقے کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں۔ انکے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔ خدا سے ڈرنے والے، آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے، اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے خواہ اُس پر قائم رہنے میں انکو فائدہ پہنچے یا نقصان۔ انہوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے، اور کہیں فتح پائی تو جبّار اور متکبر نہ پائے گئے۔

(۴) اُن کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا اُس میں انہوں نے ٹھیک اُس طرز کی حکومت قائم کی جسکو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل و انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور

اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا۔ غرض ہر پہلو میں انہوں نے اسی حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیق و فاروق نے کی تھی۔

یہ لوگ بعض طبعی اسباب کی وجہ سے، جنکا ذکر آگے آتا ہے، ناکام ہوئے، مگر خیالات میں جو حرکت وہ پیدا کر گئے تھے اسکے اثرات ایک صدی سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود اب تک ہندوستان میں موجود ہیں۔

اسباب ناکامی اس آخری مجددانہ تحریک کی ناکامی کے اسباب پر بحث کرنا عموماً اُن حضرات کے مذاق کے خلاف ہے جو بزرگوں کا ذکر عقیدت ہی کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اسلیے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں اس عنوان کے تحت عرض کرونگا وہ میرے بہت سے بھائیوں کے لیے تکلیف کا موجب ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا مقصد اس تمام ذکر اذکار سے محض سابقین بالایمان کو خراج تحسین ہی پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ آئندہ تجدید دین کے لیے ان کے کاموں سے سبق حاصل کرنا بھی ہے، تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور ان بزرگوں کے کارناموں کا سراغ لگانے کے ساتھ اُن اسباب کا کھوج بھی لگائیں جنکی وجہ سے یہ اپنے مقصد کو پہنچنے میں ناکام ہوئے۔ شاہ صاحب اور اُن کے صاحبزادوں نے علمائے حق اور صالحین کی جو عظیم القدر جماعت پیدا کی، اور پھر سید صاحب اور شاہ شہید نے علمی رو اتقیاء کا جو لشکر فراہم کیا، اُسکے حالات پڑھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرنِ اول کے صحابہ و تابعین کی سیرتیں پڑھ رہے ہیں، اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہم سے اس قدر قریب زمانہ میں اس پایہ کے لوگ ہو گذرے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمارے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی زبردست اصلاحی و انقلابی تحریک، جسکے لیڈر اور کارکن ایسے صالح و متقی اور ایسے سرگرم مجاہد لوگ تھے، انتہائی ممکن سعی و عمل کے باوجود ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، اور اسکے برعکس کئی ہزار میل سے آئے ہوئے انگریز یہاں خالص جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اس سوال کو عقیدتمندی کے جوش میں لاجواب چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ صلاح و تقویٰ اور جہاد کو اس دنیا

کی اصلاح کے معاملہ میں ضعیف الاثر سمجھنے لگیں اور یہ خیال کر کے مایوس ہو جائیں کہ جب ایسے زبردست متقیانہ جہاد سے بھی کچھ نہ بنا تو آئندہ کیا بن سکیگا۔ میں اس قسم کے شبہات فی الواقع لوگوں کی زبان سے سن چکا ہوں، بلکہ حال میں جب مجھے علی گڈھ جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اسٹریچی ہال کے بھرے جلسہ میں میرے سامنے یہی شبہ پیش کیا گیا تھا اور اسے رفع کرنے کے لیے مجھے ایک مختصر تقریر کرنی پڑی تھی۔ نیز مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت علماء صالحین کی جو جماعت ہمارے درمیان موجود ہے وہ بالعموم اس مسئلہ میں بالکل خالی الذہن ہے، حالانکہ اگر اس کی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے سبق ہمیں مل سکتے ہیں جن سے استفادہ کر کے آئندہ زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح کام ہو سکتا ہے۔

پہلا سبب پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور انکے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے، اور اسکی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال، اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف اس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے۔ اسکے سوا اُس کے لیے دوسرا قالب بھی ممکن ہے۔ اُسکے لیے زبان بھی دوسری اختیار کی جاسکتی ہے، رموز و اشارات سے بھی اجتناب کیا جاسکتا ہے، اور پیری مریدی اور اس سلسلے کی تمام عملی شکلوں کو بھی چھوڑ کر دوسری شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ اسی قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے، حالانکہ یہ پرانا قالب اس بنا پر قابلِ ترک تھا اور ہے کہ مدتہائے دراز سے اسی قالب میں جاہلی تصوف کی گرم بازاری ہو رہی ہے اور اس کی کثرتِ اشاعت سے مسلمانوں کو سخت اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا ہے، اور اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک

شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے، اگر یہ قالب جہاں استعمال کیا گیا اور پھر وہی تمام بیماریاں عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اسکے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اُس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جبکہ مریض کے لیے نقصان دہ ہو، اُسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اِس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اِسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی اِن مزمن مریضوں کو پھر وہی چُنیا بیگم یاد آجاتی ہیں جو صدیوں اِن کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی وہی "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" والی ذہنیت جسکے بعد پیر صاحب اور اربابٌ من دون اللہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوتِ تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگیٔ شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اسکے مربوب۔ پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی اور معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو گئے۔ اسکے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے جس سے مریدوں کی قوت واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انہیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بیچارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں، واقعات کی دنیا میں ٹھیرنے کا موقع غریبوں کو کم ملتا ہے۔ مسلمانوں کے اِس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اِس پر تنقید موجود ہے۔ مگر غالباً اِس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے مرض سے متأثر ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ مولانا اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی تھی جو ابن تیمیہ کی تھی لیکن شاہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی سید صاحب کی تحریک میں چل

رہا تھا، اسلیے مرضِ صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی، حتی کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی ایک گروہ انکے حلقہ میں ایسا پیدا ہوگیا جو شیعوں کی طرح انکی غیبوبت کا قائل ہوا اور اب تک اُن کے ظہورِ ثانی کا منتظر ہے۔ اب جس کسی کو تجدیدِ دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو اُسکے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات رموز و اشارات، لباس، اطوار، پیری مریدی اور ہر اُس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

دوسرا سبب دوسری چیز جو مجھے تنقیدی مطالعہ کے دوران میں محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ سید صاحب اور شاہ شہید نے جس علاقہ میں جا کر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قائم کی، اُس علاقہ کو اس انقلاب کے لیے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ اُن کا لشکر تو یقیناً بہترین اخلاقی و روحانی تربیت پائے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھا، مگر یہ لوگ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے جمع ہوئے تھے اور شمالی مغربی ہندوستان میں انکی حیثیت مہاجرین کی سی تھی۔ اس علاقہ میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خود اس علاقہ ہی کی آبادی میں پہلے اخلاقی و ذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا، تاکہ مقامی لوگ اسلامی نظام حکومت کو سمجھنے اور اُسکے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں، اور غیر مسلم اقتدار کے ستائے ہوئے بھی ہیں، اسلیے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کرینگے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جاتے ہی وہاں جہاد شروع کر دیا، اور جتنا ملک قابو میں آیا اُس پر اسلامی خلافت قائم کر دی۔ لیکن بالآخر تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اور ان سے وہ توقعات وابستہ کرنا جو اصلی مسلمان ہی پوری کر سکتے ہیں، محض ایک دھوکا تھا۔ وہ لوگ خلافت کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ جب ان پر یہ بوجھ رکھا گیا تو خود بھی گرے اور اس پاکیزہ عمارت کو بھی لے گرے۔ تاریخ کا یہ سبق بھی ایسا ہے جسے آئندہ ہر تجدیدی تحریک میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں

وہ نقش برآب کی طرح ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا، اور جب مٹتا ہے تو اس طرح مٹتا ہے کہ اپنا کوئی اثر چھوڑ کر نہیں جاتا۔

تیسرا سبب اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس تجدیدی تحریک کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دور سے آئے ہوئے انگریزوں کو کس قسم کی فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ تو یہاں جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کر سکی؟ اس کا صحیح جواب آپ نہیں پا سکتے جب تک کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپ کی تاریخ آپ کے سامنے نہ ہو۔ شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے اسلام کی تجدید کے لیے جو کام کیا، اُسکی طاقت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیے اور دوسرے پلڑے میں اُس طاقت کو رکھیے جس کے ساتھ انکی ہم عصر جاہلیت اٹھی تھی، تب آپ کو پورا اندازہ ہوگا کہ اس عالم اسباب میں جو قوانین کارفرما ہیں اُن کے لحاظ سے دونوں طاقتوں میں کیا تناسب تھا۔ میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ کہوں کہ ان دونوں قوتوں میں ایک تولے اور پچاس من کی نسبت تھی اسلیے نتیجہ جو فی الواقع رونما ہوا اُسکے سوا اور کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے، اسی دور میں یورپ قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں ہر علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔ وہی دور تھا جس میں ہیوم، کانٹ، فشتے (Fichte)، ہیگل، کونت (Comte)، شلائر ماشر (Schliermacher) اور مِل جیسے فلاسفہ پیدا ہوئے جنہوں نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کیا۔ وہی دور تھا جب طبیعیات میں گیلوینی (Galvani) اور وولٹا (Volta)، علم الکیمیا میں لاووزیرلے Lavoisier پریسٹلے (Priestlay)، ڈیوی (Davy)، ہائوی (Haüy)، اور برزلیس (Berzelius)، احیاتیات میں لینے (Linne)، ہالر (Haller)، بیشات (Bichat) اور

وولف (Wolff) جیسے محققین اٹھے جنکی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کردیا۔ اسی دور میں کویسنے (Quesnay)، ٹرگوٹ (Turgot)، آدم سمتھ اور مالتھس کی دماغی کاوشوں سے معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ وہی دور تھا جب فرانس میں روسو، والٹیر، مونٹسکیو، ڈینس ڈائڈیرو (Denis Diderot)، لامیٹری (Lat Mettrie)، کیبانیس (Cabanis)، بفون (Buffon)، روبینز (Robinat)، انگلستان میں ٹامس پین (Paine)، ولیم گوڈون (Godwin)، ڈیوڈ ہارٹلے، جوزف پریسٹلے، اراسمس ڈارون، اور جرمنی میں گوئٹے، ہرڈر، شیلر، ونکلمان (Winckelmann)، لسنگ (Lessing)، اور بیرن ڈی ہولباش (Baron d'Holbach) جیسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اخلاقیات، ادب، قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمران پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرأت و بےباکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کرکے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔ پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب بیان کی ندرت، اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعۂ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے اِن لوگوں کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انہوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متأثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیئے، نظام تعلیم بدل دیا، نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا، اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل ڈالا۔ اسی زمانہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائلِ زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانہ میں انجینیرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فنِ جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرِل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے

میدان جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلہ میں ٹھیرنا مشکل ہوگیا۔ فوجوں کی ترتیب، عساکر کی تقسیم اور جنگی چالوں میں بھی بہم تغیرات ہوئے، اور ہر جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھاکر اس فن کو برابر ترقی دی جاتی رہی۔ آلات حرب میں بھی مسلسل نئی ایجادیں ہوتی چلی گئیں رائفل ایجاد ہوئی، ہلکی اور سریع الحرکت میدانی توپیں بنائی گئیں، قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور تیار کی گئیں، اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلہ میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بیکار کرکے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلہ میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں، اور نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کرلیا۔

معاصر تاریخ کے اس سرسری خاکے پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند خاص اشخاص ہی بیدار ہوئے تھے مگر وہاں قوموں کی قومیں جاگ پڑیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا تھا، اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کر ڈالا گیا بلکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ تھا جس میں تیز رفتار پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں، اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھاگئیں اور آخرکار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہوگئیں۔ یہاں فلسفہ، اخلاقیات، اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم پر طرح نو کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک رہی جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا، اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظام فکر مرتب ہوگئے جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یہاں علوم طبیعیہ اور قوائے مادیہ کا علم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا، اور وہاں اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی اور اس ترقی کی بدولت اہلِ مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ اُن کے مقابلہ میں پرانے آلات و وسائل کے زور سے کامیاب ہونا قطعی محال تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الہ آباد تک انکا اقتدار پہنچ چکا تھا، مگر انہوں نے اِس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں تو دھلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے مگر اُنکے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسبابِ طاقت کیا ہیں۔ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے تھے۔ انہوں نے سارے انتظامات تو کیے مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جارہی ہے، اور نئے آلات نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے، اِس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے، اُس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں، اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے، اور اسکے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس وقت یہ حضرات جہاد کے لیے اٹھے ہیں، اُس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریز کی ہے، اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالف طاقت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو انگریز ہی کی ہو سکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دور رس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے جس حریف سے نمٹنا ہوگا اُسکے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کریں، اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کریں۔ بہرحال جب ان سے یہ چوک ہوئی تو اِس عالمِ اسباب میں ایسی چُوک کے نتائج سے وہ نہ بچ سکتے تھے۔

مغربی جاہلیت کے مقابلہ میں اسلامی تجدید کی اس تحریک کو جو ناکامی ہوئی اُس سے پہلا سبق تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ تجدید دین کے لیے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام

فنون وصناعات اور تمام شعبہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے۔ اور دوسرا سبق جو اسی سے قریب الماخذ ہے، یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کے کام سے عہدہ برا ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جاہلیتِ جدیدہ بے شمار نئے وسائل کے ساتھ آئی ہے اور اس نے بے حساب نئے مسائلِ زندگی پیدا کر دیے ہیں جنکا وہم تک شاہ صاحب اور دوسرے قدماء کے ذہن میں نہ گذرا تھا۔ صرف اللہ جل جلالہ کے علم اور اسکی بخشش سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت ہی پر یہ حالات روشن تھے، لہذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کے لیے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور اس رہنمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہ عمل تعمیر کرنے کے لیے ایسی مستقل قوتِ اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو، اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔

نیا نظامِ تعلیم

[یہ وہ خطبہ ہے جو ۵ رجنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی انجمن اتحادِ طلبہ کے سامنے مدیر "ترجمان القرآن" نے عرض کیا]

حضرات! خوش قسمتی سے آج مجھے اُس جگہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل رہا ہے جہاں موجودہ دور میں سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم کی اصلاح کا تخیل پیدا ہوا، اور سب سے پہلا قدم اسکی طرف اٹھایا گیا۔ اسی وجہ سے میں نے اس موقع کے لیے تعلیمی اصلاح ہی کے سوال کو اپنا موضوعِ بحث منتخب کیا ہے۔ میرے اس انتخاب میں ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری دینی درسگاہوں میں عموماً اصلاحِ تعلیم کے مسئلے پر گفتگو چھڑی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس تو پیدا ہو گیا ہے، مگر جس انداز سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اصلاح کی خواہش کرنے والوں کے ذہن میں مسئلہ کی نوعیت کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض ضروری علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔ اسلیے اصلاح کی ساری بحث صرف اس حد تک محدود رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے کچھ دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے، عناصرِ تعلیمی کے تناسب میں ترمیم کر کے بعض اجزاء گھٹائے اور بعض بڑھائے جائیں، اور قدیم علوم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم کی بھی کچھ کتابیں طلبہ کو پڑھائی جائیں۔ ایسی ہی کچھ جزوی ترمیمات طرزِ تعلیم اور انتظامِ مدارس میں بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ اور بہت زیادہ "روشن خیالی"